اِملاے غالبؔ

رشید حسن خاں

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

اِملاے غالب

رشید حسن خاں

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

Imla-e-Ghalib
By:
Rasheed Hasan Khan

سالِ اشاعت : ۲۰۰۰ء
قیمت : ۱۰۰؍روپے
مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۔۲

غالبؔ کے سچّے قدرداں، قدر شناس

اور مکتوباتِ غالبؔ کے بہت اچھّے مجموعے

خطوطِ غالبؔ کے مُرتّب

مولوی مہیش پرشاد (مرحوم)

کی یاد میں

فہرست

پہلا حصّہ

الفاظ:

دوسرا حصّہ

قاعدے:

ابتدائیہ

مرزا غالبؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی تحریریں موجود ہیں اور اُن کے عکس دست یاب ہیں۔ اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں جو لفظ املا کے لحاظ سے توجہ طلب ہیں، اُن کو مرزا صاحب نے اِن تحریروں میں اپنے قلم سے جس طرح لکھا ہے؛ ایسے لفظوں کا گوشوارہ مرتب کیا گیا ہے۔ جن لفظوں کے املا سے متعلق اُنھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ اُن کا صحیح املا کیا ہے، ایسے لفظوں کو بھی اِس گوشوارے میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ایسے سب لفظوں کو، اِن کے ضروری متعلقات اور مثالوں کے ساتھ حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ اِس کتاب کے پہلے حصے میں رکھا گیا ہے۔

دوسرے حصے میں املا سے متعلق مرزا صاحب کی مختلف وضاحتوں کی روشنی میں اور اُن کے حوالے سے، املا کے اصولوں کو اور قاعدوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ ''املاے فارسی'' کے عنوان کے تحت فارسی طریقِ املا اور متعلقاتِ املا کو بھی اِسی حصے میں یک جا کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مرزا صاحب کے اُردو، فارسی کلام کی تدوین میں مرتب، یا مرتبین املا کے جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہوسکتے ہیں، اُن کی نشان دہی کی جائے۔ یہ واضح کیا جائے کہ خود مرزا صاحب نے

اپنے قلم سے کس لفظ کو کس طرح لکھا ہے، یا کس طرح لکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اِس طرح کلامِ غالبؔ میں منشائے مصنف کے خلاف املائی صورتیں جگہ نہ پاسکیں۔ ضمنی طور پر املائی معیار بندی کا فائدہ بھی حاصل ہو کہ اُن کے کلامِ نظم و نثر کے مختلف مجموعوں میں لفظوں کے املا میں دورنگی نمود حاصل نہ کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک مجموعے میں ایک لفظ کو ایک طرح لکھا جائے اور دوسرے مجموعے میں دوسری طرح۔ (یہ واضح کر دیا جائے کہ اِس قماش کی دورنگیِ املا کی مثالیں اُن مجموعوں میں بڑی تعداد میں ملتی ہیں جو پچھلے ۳۵، ۴۰ سال میں شائع ہوئے ہیں)۔

سیّد انشاؔ اور مرزا غالبؔ، اُردو کے دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے قواعدِ زبان، تلفظ اور املا سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ دونوں ذہنی طور پر تقلید بیزار تھے، جدّت پسندی اور آزاد خیالی نے طاقتور اعتماد کو اُن کی شخصیت کا جز بنا دیا تھا؛ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے بغیر اپنی بات کہتے تھے اور اپنی رائے پر اصرار بھی کرتے تھے۔ ہاں اِن دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ شاعر کی حیثیت سے اور اُردو کے نثر نگار کی حیثیت سے مرزا صاحب کا مرتبہ بلند تر ہے اور قواعدِ زبان اور زبان شناسی کے لحاظ سے انشاؔ اعلا و افضل ہیں۔

یہ سچ ہے کہ آدمی کتنی ہی ذہنی رفعت اور فنّی کمال حاصل کر لے، بشریّت پر فتح نہیں پا سکتا۔ وہ غلطیاں بھی کر سکتا ہے اور غلط فیصلے بھی؛ مگر اِن سے اُس کا منفرد طرزِ احساس کم تاب نہیں ہوتا، اُس کی بے مثالیت مجروح نہیں ہوتی اور اُس کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ یہاں چند لمحوں کے لیے رُک کر ہم یہ ضرور سمجھ لیں کہ اختلافِ رائے اور غلطی، یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہم غلطی سے اتّفاق کرنے پر اپنے آپ کو مجبور نہیں کر سکتے، لیکن اختلافِ رائے کو مصنف کا حق ماننے پر ہم سب مجبور ہیں۔ جو اِس پر مجبور نہیں، وہ بے انصاف ہوں گے یا کم نظر۔ ادب میں کٹھ مُلّائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

مرزا صاحب نے (اور مسائل کے ساتھ ساتھ) املا سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ خطوں میں اُن کے ایسے اقوال بکھرے ہوئے ہیں۔ اصلاحِ کلام کے ذیل میں املا کی غلطیوں کی طرف بھی شاگردوں کی توجہ مبذول کراتے رہتے تھے اور لفظوں کی جن املائی شکلوں کو وہ درست

سمجھتے تھے، اُن کی بھی نشان دہی کرتے رہتے تھے اور بار بار ٹوکتے تھے۔ مثلاً قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا ہے:

"صاحب! تم نے مثنوی خوب لکھی ہے۔ کہیں املا میں، کہیں انشا میں جو اغلاط تھے، دور کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی" (خطوطِ غالب، مرتبہ مولوی مہیش پرشاد، ص ۱۸۸)۔

منشی بہاری لال مشتاق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں تم کو جا بہ جا آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ زائل ہو جائے" (غالب کے خطوط، ص ۱۰۳۹)۔

صوفی منیری کے نام خط میں لکھا ہے: "حکم بجا لایا۔ دو ایک جگہ املا کی صورت بدل گئی" (ایضاً، ص ۱۴۴۲)۔ "فارسی اشعار میں جہاں جہاں املا یا انشا میں اختلاف تھا، اُس کو درست کر دیا" (بہ نامِ مولانا عباس رفعت بھوپالی۔ ایضاً، ص ۳۷۱)۔ اِن عبارتوں سے یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ املا کی صحت کا خیال بہ طورِ خاص اُن کے ذہن میں رہتا تھا۔

مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ "پانو، گانو، چھانو" صحیح املا ہے اور "پاؤں" لکھنے کو غلط مانتے تھے۔ ایک شاگرد کو لکھا ہے:

"پانو، قافیہ گانو، چھانو کا ہے۔ آگے اُس کے نون لکھنا غلط ہے، مگر ہاں بہ صیغۂ جمع یوں لکھنا چاہیے: پانوؤں" (خطوطِ غالب، مقدمہ، ص ح)۔

بیتاب رام پوری کا مصرع تھا: "ہے گریباں ہاتھ میں اور پانو میں زنجیر ہے"۔ مرزا صاحب نے غزل پر اصلاح دیتے ہوئے "میں" سے پہلے نؔ کو قلم زد کر دیا (مکاتیبِ غالب، مرتبہ عرشی صاحب، ص ۹۵)۔

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی نے "ننگے پاؤں" لکھا تھا، اصلاح کے تحت مرزا

صاحب نے لکھا:

''ننگے پاؤں، واو کے ضمّے کو اشباع کیسا؟ یہ تو ترجمہ ''پابم'' کا ہے۔ اور پھر ''پاوں'' کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو'' (خطوطِ غالب، ص ۱۱۸)۔

اِس ایک لفظ کے صحیح املا کی تاکید پر کس قدر اصرار کیا گیا ہے! اِن چند مثالوں سے یہ بات بہ خوبی روشن ہو جاتی ہے کہ وہ صحتِ املا کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اہمیت دینے کا احوال یہ تھا کہ وہ بعض اوقات بہت سخت الفاظ استعمال کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ تفتہ کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جن کلمات میں ے جزوِ کلمہ ہوتی ہے (جیسے: گرہ کشاے، ہماے، یا جیسے راے، ہاے، واے (وغیرہ) اِس ے پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے؛ اِس بات کو اِس طرح کہا ہے کہ اِس ے پر ہمزہ لکھنا ''گویا عقل کو گالی دینا ہے'' (خطوطِ غالب، ص ۲۴)۔ اِس سے اچھی طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لفظوں کے صحیح املا پر کس قدر زور دیتے تھے اور نظر رکھتے تھے۔

نامۂ غالب میں مرزا رحیم بیگ کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں: ''میں کیوں کر..... کاتبوں کی املا کو مصحفِ مجید کی طرح سر پر دھر لوں؟ یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جماد و نبات فرض کرلوں.... انشا میں ناسخوں کی تحریف کو مانتے ہو، املا میں کاتبوں کی غلطی کے کیوں نہ قائل ہو۔ انشا و املا و لفظ و معنی میں تقلید کو چھوڑ کر تحقیق کے کیوں نہ مائل ہو'' (قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ، ص ۲۵۱)۔ غزل کے ایک شعر میں صحیح املا کو ''صورتِ موزوں'' سے تعبیر کیا ہے:

نہ انشا معنیِ موزوں، نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہ ہاے اہلِ دُنیا، ہرزہ عنواں ہیں
(دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۶۲)

''صورتِ موزوں'' بڑی پُر معنی ترکیب ہے۔ املا درست نہ ہو تو لفظ کی صورت ناموزوں ہو جاتی ہے، بگڑ جاتی ہے۔ اِس سے اِس بات کو اور زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ مرزا صاحب کی نظر میں صحتِ املا کی حیثیت کیا تھی۔

املا کی صحت کے اہتمام کو ملحوظ رکھنا تو ویسے بھی ضروری ہے، مگر جس مصنف کی نظر اور ذہن میں املا کی یہ اہمیت ہو، اُس کے کلام میں تو ازبس ضروری ہے۔ اِس راستے کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ مرزا صاحب نے املا سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ بکھرا ہوا ہے، کچھ اس خط میں، کچھ اُس کتاب میں۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے لفظوں کو جس طرح یا جس جس طرح لکھا ہے، ایسا کوئی گوشوارہ مرتّب نہیں کیا گیا جس میں ایسے سب لفظ یک جا طور پر سامنے رہیں اور اُن کے ساتھ ضروری توضیحات اور بہت ضروری تفصیلات بھی ہوں۔ اِن دو کمیوں کے سبب سے مرزا صاحب کی نظم و نثر کی نسبت سے لفظوں کی صورت نگاری سے متعلق معلومات مکمّل طور پر سامنے نہیں آسکی۔ یہ اِسی بکھراو کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی لفظ کسی نے ایک طرح لکھا اور دوسرے نے دوسری طرح۔ اور یہ بھی ہوا کہ ایک ہی شخص کی مرتّب کی ہوئی کتاب میں بہ لحاظِ املا یکسانی نہیں۔ ایک ہی لفظ کی کہیں کوئی شکل سامنے آتی ہے اور کہیں وہی لفظ دوسری صورت میں سامنے آتا ہے۔

یہاں ذرا سی دیر کے لیے اصل موضوع سے ہٹ کر ایک سخن گسترانہ بات کہنا چاہتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) سے ایک علمی مجلّہ غالب نامہ شائع ہوتا ہے۔ اب سے پہلے کئی برس تک میں بھی اُس کی مجلسِ ادارت کا رکن رہا ہوں۔ اس میں چھپنے کے لیے جو مضامین آتے تھے، اُن میں سے بیش تر مضامین میں املا اور انشا کی ہر طرح کی فروگذاشتیں ملتی تھیں اور بیش تر املائی غلطیاں بے توجہی کی پیدا کی ہوئی ہوتی تھیں۔ مثلاً کم حضرات تھے جو ہاے ملفوظ اور ہاے مخلوط کی صورت نگاری میں امتیاز کو بہ طورِ التزام ملحوظ رکھتے ہوں۔ جہاں جس طرح جس لفظ کا نقش بن جائے۔ کاما، فل اسٹاپ سے بھی دور کی شناسائی معلوم ہوتی تھی۔ تشدید اور اضافت کے زیر تو اُردو لکھاوٹ کا حصّہ ہی نہیں بن پائے ہیں، اِس لیے اُن کے نہ ہونے کا کیا شکوہ۔ نقطوں کا ہر حرف پر ہونا اور صحیح جگہ ہونا بھی کچھ ایسا ضروری نہیں تھا۔ بعض مضامین تو پرانے حکیم صاحبان کے نسخے ہوتے تھے کہ لفظوں کو اٹکل سے پڑھ لیجیے۔ یہ خیال رہے کہ یہ ذاتی خط نہیں ہوتے تھے اور نہ ذاتی بیاضوں کے اندراجات —— یہ علمی مضامین ہوتے تھے۔ اِس پر بھی صبر کیا

جا سکتا تھا (اِس لیے بھی کہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا) مگر غضب کی بات تو یہ تھی کہ بعض مضامین اُن حضرات کے بھی ہوتے تھے جو تدوین میں مہارت کے دعوے دار ہیں اور گاہے گاہے متن کی ترتیب و تصحیح کا کام بھی کر لیا کرتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ جو شخص اپنی تحریر میں آدابِ تحریر کو ملحوظ نہیں رکھ سکتا، صحتِ املا کا التزام نہیں کر سکتا؛ وہ شخص کسی دوسرے کی تحریر کی تصحیح کیسے کر سکتا ہے اور تدوین کی مشکل ترین ذمے داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ یہ ضمنی بات یہاں ختم ہوئی۔

ایک بڑا مسئلہ مرزا صاحب کے فارسی کلام کی تدوین کا ہے۔ یہ حقیقت ہے، اگرچہ بہت تلخ ہے، کہ اب تک ہمارے یہاں مرزا صاحب کے کلّیاتِ نظم و نثرِ فارسی کا ایسا کوئی نسخہ شائع نہیں ہوا جس کے لیے کہا جا سکے کہ اُسے آدابِ تدوین کی پابندی کے ساتھ مرتّب کیا گیا ہے۔ تاریخِ وفات کے حساب سے اُن کی سو سالہ یادگار منائی گئی، بہت اہتمام اور دھوم دھام کے ساتھ۔ پھر تاریخِ ولادت کے لحاظ سے دو سو سالہ جشنِ یادگار بھی منا لیا گیا۔ پچھلے تیس برسوں میں سیمنار تو معلوم نہیں کتنے ہوئے ہوں گے، مقامی بھی، کُل ہند بھی اور بین الاقوامی بھی؛ لیکن جو کام سب سے پہلے کرنے کا تھا، اُس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

چوں کہ کلّیاتِ فارسی کی تدوین کا کام اصولِ تدوین کے مطابق نہیں ہوا، اِس لیے اِس کے مسائل بھی سامنے نہیں آ سکے، خاص کر املا کے مسائل۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ مرزا صاحب کی فارسی نظم و نثر کے چھپے ہوئے مجموعوں میں سے کوئی بھی دو مجموعے بہ لحاظِ املا باہم مطابقت نہیں رکھتے۔ بہ لحاظِ اصولِ تدوین کلام کو مرتّب کیا جاتا، تب ایسے مسائل سامنے آتے۔ املاے فارسی سے متعلق مرزا صاحب کے اہم اقوال اور توضیحات اُن کے خطوں میں اور برہانِ قاطع کی بحث سے متعلق تحریروں میں موجود ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنا ہر مرتّب کے لیے لازم ہے۔

یہ باہم عدمِ مطابقت، جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، غیر مناسب بھی ہے اور پریشان کن بھی۔ اِس کا اندازہ ایک ہی مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ غالب صدی (۱۹۶۹ء) کے موقعے پر ہمارے یہاں تو کلّیاتِ نظمِ فارسی کا کوئی نسخہ (میری معلومات کی حد تک) مرتّب نہیں ہوا؛ ہاں

پاکستان میں چھپے ہوئے دو نسخے میں نے لاہور میں دیکھے تھے، یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک کلیاتِ فارسی تو مکتبہ میری لائبریری (لاہور) نے شائع کیا تھا۔ اِس کے مرتّب تھے معروف اہلِ قلم اور ''غالب شناس'' ڈاکٹر وزیرالحسن عابدی، اُس میں ایک غزل کے دو شعر اس طرح چھپے ہوئے ہیں:

نمی بینیم در عالم نشاطے، کاسمان مارا — چو نور از چشمِ نابینا، ز ساغر رفت صہبا را

مکن ناز و ادا چندین، دلی بستان و جانی ہم — دماغِ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را

اِن دونوں شعروں میں سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک جگہ ''نشاطے'' ہے (جس طرح ہونا چاہیے) اور دو جگہ ''دلی'' اور ''جانی'' (بہ یاے معروف) ہیں؛ یہ دورنگیِ املا کسی بھی لحاظ سے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ فرمودۂ غالب کے مطابق (جس کا حوالہ آگے آئے گا) اِن تینوں لفظوں کو مع یاے مجہول (نشاطے، دلے، جانے) لکھا جانا چاہیے تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ''آسمان'' اور ''چندین'' مع نونِ نقطہ دار ہیں اور یہ درست نہیں۔ مرزا صاحب کے اصول کے مطابق (اور ہندستانی اور کلاسکی فارسی کے طریقِ املا و تلفظ کے مطابق) اِن دونوں لفظوں کے آخر میں نونِ غنّہ ہے؛ اِنھیں ''آسماں'' اور ''چندیں'' ہونا چاہیے تھا۔ فرمودۂ غالب کے مطابق ''برنمی تابد'' بھی درست نہیں، ''برنمے تابد'' ہونا چاہیے۔ (اگر ''برنمیابد'' لکھا جائے، تو تلفظ میں یاے مجہول ہی رہے گی، یعنی پڑھنے میں ''برنمے تابد'' آئے گا۔ اِس کی وضاحت اِس کتاب کے دوسرے حصّے میں ''املاے فارسی'' کے تحت کی گئی ہے)۔

وزیرالحسن عابدی صاحب ہی کا مرتّب کیا ہوا کلیاتِ نظمِ فارسی پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی طرف سے اُسی زمانے میں شائع ہوا تھا، اُس میں یہی دونوں شعر اس طرح ملتے ہیں:

نمی بینیم در عالم نشاطی، کاسمان مارا — چو نور از چشمِ نابینا، ز ساغر رفت صہبا را

مکن ناز و ادا چندین، دلے بستان و جانے ہم — دماغِ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را

یہاں پہلے نسخے کے اندراج سے مختلف صورت سامنے آتی ہے۔ وہاں ''نشاطے'' ہے، مگر اِس نسخے میں ''نشاطی'' ہے۔ اِس اشاعت میں ''دلے'' اور ''جانے'' ہے جب کہ اُس نسخے میں

''دلی'' اور ''جانی'' ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ دونوں نسخے ایک ہی فاضل شخص کے مرتّب کیے ہوئے ہیں۔

یہ جو صورتِ حال پیدا ہوئی کہ مرتّب ایک ہے، لیکن دونسخوں میں املاے الفاظ باہم مختلف ہے اور مرتّب کو یہ معلوم نہیں کہ یاے معروف و مجہول اور نونِ غنّہ سے متعلق خود مصنّف نے وضاحت اور قطعیّت کے ساتھ کیا لکھا ہے؛ یہ غیر مناسب صورتِ حال اِسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ املاے غالب کے متعلقات پر غور نہیں کیا گیا اور متعلّقاتِ املا اور مباحثِ املاے فارسی کی ضروری تفصیلات کا گوشوارہ نہیں بنایا گیا۔

یہاں ضمناً یہ وضاحت کرنا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معروف، مجہول اور غنّہ آوازوں کا مسئلہ، صرف تلفّظ اور لہجے کا مسئلہ نہیں، اِس کا گہرا تعلّق املاے الفاظ سے ہے۔ ہندستانی فارسی میں شروع دن سے آج تک یہ آوازیں شاملِ تلفظ رہی ہیں۔ یہاں جتنے لغت مرتّب ہوئے، قواعد کی جس قدر کتابیں لکھی گئیں، سب میں بالتصریح یہ لکھا گیا ہے کہ فلاں لفظ میں یاے مجہول ہے کہ یاے معروف۔ اِسی طرح معروف و مجہول واو کی نشان دہی کی گئی ہے۔ قافیے کے بیان میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تقفیہ معروف و مجہول سے بچنا چاہیے۔ ایران میں بھی یہ سب آوازیں فارسی زبان کا جُز تھیں۔ اب ایران کے مرکزی لہجے یعنی تہرانی لہجے میں مجہول اور غنّہ آوازیں شامل نہیں؛ مگر یہ اب کی بات ہے۔

مرزا صاحب کی ایران دوستی سے سب واقف ہیں، وہ ہندستانی لغت نگاروں کو نہیں مانتے تھے؛ اِس کے باوجود وہ مجہول اور غنّہ آوازوں کو مانتے تھے۔ وہ اِس پر اصرار کرتے تھے کہ فارسی قواعد کا تتبّع لازم ہے، لیکن لہجے کے تتبّع کے سخت خلاف تھے۔ قلق کو ایک خط میں لکھا ہے:

> ''صاحبِ بندہ! تحریر میں اساتذہ کا تتبّع کرو، نہ مغل کے لہجے کا۔ لہجے کا تتبّع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا سلام'' (خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۱۷۹)۔

غنہ آواز کے تعلق سے بھی یہی بات لکھی ہے۔ معترض کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اِسی ۱۸اور ۱۹ صفحے میں، جہاں ''کندیدن'' کو غلط بتاتے ہیں، اور ''مانْد'' و ''خوانْد'' کو بروزنِ ''چانْد'' غلط بتاتے ہیں اور ''مُند'' و ''خُند'' کو بروزنِ ''تنْد'' و ''گند'' صحیح فرماتے ہیں..... لاحول وَ لا قُوّۃَ اِلّا بِاللہ! اہلِ ایران الف کو سُلا دیتے ہیں اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبّع قواعد کا چاہیے۔ لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے'' (قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۲۷۰)۔

مرزا صاحب کی اِن وضاحتوں کی روشنی میں یہ لازم ہوگا کہ اُن کے فارسی کلام میں معروف، مجہول اور غنہ آوازوں کے تعیّن کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے۔ مرزا صاحب کی وضاحت کے مطابق توصیف، تنکیر، تعظیم اور وحدت کے لیے لفظ کے آخر میں یاے مجہول آتی ہے (جیسے شخصے: ایک شخص یا کوئی شخص۔ خدائے کہ: ایسا خدا جس نے) مرزا صاحب نے تاکیداً لکھا ہے کہ ایسے مواقع پر: ''ہرگز یاے معروف نہیں، یاے مجہول ہے۔ یاے معروف یہاں نامقبول ہے'' (مکتوب بہ نامِ چودھری عبدالغفور سرور۔ ادبی خطوطِ غالب، ص ۳۵)۔ کلّیاتِ فارسی کے محوّلہ بالا نسخوں میں جو محلِ نظر مقامات ہیں، اُن کی دو بڑی وجہیں معلوم ہوتی ہیں: مرزا صاحب نے بہ ذیلِ املا جو کچھ لکھا ہے، جو وضاحتیں کی ہیں؛ اُن کا مرتب نہ ہونا اور پیشِ نظر نہ رہنا۔ صحتِ املا کی ناگزیر اہمیّت کا احساس نہ ہونا، یا یوں کہیے کہ مسائلِ املا کی تفصیلات سے بے خبر ہونا۔ یہی صورتِ حال اِس کتاب کی ترتیب کا محرک بنی ہے۔ میں بس ایک مثال اور پیش کروں گا۔ مرزا صاحب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے: ''ناشتا، اُس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اُس کی: نہار منہ۔ تم لکھتے ہو: اے عجب ناشتا فرستادی۔ یعنی غذاے صبح، جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: اُس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں'' (خطوطِ غالب، ص ۹۹)۔ مرزا محمد عسکری نے

ادبی خطوطِ غالب میں اِس عبارت کو نقل کیا (ص ۱۰۰) کاتب صاحب نے آخری سطر میں ''ناشتا'' کو ''ناشتہ'' بنادیا: ''اُس نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں'' اور مصحّح نے اِس کی تصحیح نہیں کی۔ مرزا صاحب کی تحریر میں خواہ مخواہ ایک لفظ کے دو املا (ناشتا۔ ناشتہ) سامنے آتے ہیں، جن میں سے ایک مرزا صاحب کی منشا کے خلاف ہے۔ اِس عبارت میں یہ لفظ چار جگہ آیا ہے۔ تین جگہ ''ناشتا'' ہے اور ایک جگہ ''ناشتہ''۔ ایک عام قاری کے لیے یہ طے کرنا بہت مشکل ہوگا کہ اِن میں سے ''صورتِ موزوں'' کون سی ہے۔

ایک ضمنی بات۔۔۔: املا اور روشِ کتابت دو مختلف چیزیں ہیں۔ مثلاً اِس سے پہلے آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف و مجہول کی کتابت میں یہ امتیازِ صورت ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا کہ یاے مجہول کو دراز صورت میں (ے) لکھا جائے اور یاے معروف کو لازماً ی کی صورت میں لکھا جائے۔ یا جیسے ہ اور ھ کا امتیاز۔ یہ روشِ کتابت تھی، جو بدل گئی۔ یہ املا نہیں تھا۔ مرزا صاحب مثلاً ''پانو'' کو صحیح سمجھتے تھے اور ''پاؤں'' کو درست نہیں سمجھتے تھے؛ یہ املا کا اختلاف ہے اور بحث املا کے اختلاف سے ہوتی ہے، روشِ کتابت سے نہیں۔ مرزا صاحب نے ''زندگی'' کو ''زندگے'' لکھا تو یہ اِس لفظ کا املا نہیں تھا۔ یہ اُس زمانے کی عام روشِ کتابت تھی۔ مرزا صاحب نے اصلاً زندگی (زندگ ی) ہی لکھا تھا، یوں کہ اِس لفظ کا تلفظ بھی یہی تھا۔ ''زندگے'' کہتے نہیں تھے، کہتے تھے ''زندگی''۔ زندگی کو ''زندگے'' لکھا گیا تو یہ املا کا اختلاف یا املا کی تصحیح نہیں؛ یہ روشِ کتابت کا نقش تھا جو بدل گیا۔ اِس سلسلے میں دوسرے حصّے میں ''ہ۔ ھ'' کے عنوان کے تحت بھی وضاحت کی گئی ہے۔ اِس کتاب کا موضوع املا ہے، روشِ کتابت نہیں۔ ''ناشتا'' کو ''ناشتہ'' لکھنا، یا ''معمّا'' کو ''معمّہ'' لکھنا املا کی غلطی ہے، اور پرانی تحریروں میں مثلاً ''گھر'' کا لفظ ''گہر'' لکھا ہوا ملتا ہے؛ تو یہ املا کی غلطی نہیں، یہ روشِ کتابت ہے۔ تصحیح دونوں کی واجب ہے؛ مگر دونوں میں جو فرق ہے، اُسے ذہن میں ضرور رہنا چاہیے۔

اِس کتاب کے پہلے حصّے میں (جو گوشوارۂ الفاظ پر مشتمل ہے) اور دوسرے حصّے میں (جس میں مرزا صاحب کی وضاحتوں کی روشنی میں املا کے قاعدوں کا بیان ہے) کم و بیش کی

نسبت کے ساتھ ضروری مثالوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اُردو اشعار کے لیے بہ طورِ عموم دیوانِ غالب نسخۂ عرشی اور فارسی مثالوں کے لیے انتخابِ غالب (مرتبۂ عرشی صاحب) کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت کردی جائے کہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی اشاعتِ اوّل (۱۹۵۸ء) کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ایک دو ضمنی حوالوں سے قطعِ نظر، اِس نسخے کی اشاعتِ ثانی (۱۹۸۲ء) کو بہ طورِ کتابِ حوالہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس اشاعت کے سرورق پر بہ طورِ مرتب نام تو عرشی صاحب ہی کا چھپا ہوا ہے؛ مگر یہ مجھے معلوم ہے کہ اشاعتِ اوّل پر نظرِ ثانی کا کام اُن کی طویل علالت کے دوران ہوتا رہا، جو مکمل طور پر اُن کا کام نہیں۔ اِس نسخے میں کچھ اضافے بھی ہیں اور اِن کے ذمّے دار بھی وہ نہیں۔ بعض کمیوں اور کچھ فروگذاشتوں کے باوجود، کتابِ حوالہ کی حیثیت نسخہ اشاعتِ اوّل کو حاصل ہے، جو مکمل طور پر عرشی صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے۔

مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے عکس کے لیے مندرجۂ ذیل ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اور اکثر صورتوں میں زمانی تقدیم کو ملحوظ رکھا گیا ہے (علم اور دست یابی ماخذ کی شرط کے ساتھ):

۱۔ خطوطِ غالب (جلدِ اوّل) مرتبۂ مولوی مہیش پرشاد۔ طبعِ اوّل، ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد۔ سالِ طبع: ۱۹۴۱ء۔ اِس اشاعت کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اُس میں شامل عکسی تحریروں کی تفصیل یہ ہے: ایک طویل خط بہ نامِ منشی ہرگوپال تفتہ (مکتوبہ ۲۲ / مارچ ۱۸۵۲ء، ص ۶ کے مقابل)۔ ایک خط بہ نامِ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (۲۸ / اگست ۱۸۵۹ء۔ ص ۱۱۶ کے مقابل)۔ ایک لفافے کا عکس، جس پر پتا مرزا صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ (ص ۱۱۳ کے مقابل) ایک نامکمل خط (ص ۱۲۰ کے مقابل)۔ ایک خط بہ نامِ میر مہدی مجروح (۱۸۶۲ء۔ ص ۲۸۱ کے مقابل)۔ ایک خط بہ نامِ شیونراین آرام (ص ۴۰۴ کے مقابل)۔[۱] یعنی خطوطِ غالب میں، جو عرشی صاحب کے مرتب کیے ہوئے مجموعے مکاتیبِ غالب

۱۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اِس نام کے دو مجموعے ہیں: ایک اصلی اور ایک نقلی (یعنی اصل نسخے کی نقل)۔ اصلی نسخہ تو یہی ہے جس کے سرورق پر بہ طورِ مرتب مہیش پرشاد کا نام لکھا ہوا ہے (اور میں نے بہ طورِ ماخذ

(اشاعتِ اوّل، ۱۹۳۷ء) کے بعد، بہ لحاظِ صحتِ متن سب سے بہتر مجموعہ ہے: کل چار مکمّل اور ایک نامکمّل خط کے عکس شامل ہیں اور ایک لفافے کا عکس ہے۔ (ہاں مکاتیبِ غالب میں کوئی عکس شامل نہیں)۔

۲۔ مرقّعِ غالب، مرتبہ پرتھوی چندر۔ لکشمی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ سالِ طبع: ۱۹۶۹ء۔ یہ بہت وقیع مجموعہ ہے، زمانی تقدّم کے لحاظ سے اِس میں مرزا صاحب کی خطّی تحریروں کے سب سے زیادہ عکس محفوظ ہیں۔ نوّابینِ رام پور کے نام خطوط کے عکس

اسی نسخے کو سامنے رکھا ہے)۔ نقلی نسخہ وہ ہے جس کے سرورق پر مرتّب کی حیثیت سے "مالک رام" چھپا ہوا ہے، مگر اُن کی ایک صفحے کی تحریر بھی اِس میں موجود نہیں، جس سے صحیح صورتِ حال کا علم ہو سکے اور ضروری باتیں معلوم ہو سکیں کہ اصل مرتّب کا نام کس نے ہٹایا اور کیوں اور کیا اضافے بھی کیے گئے ہیں؟ اِسے انجمن ترقّیِ اردو (ہند) علی گڑھ نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا۔ اِس میں دو صفحے کا "تعارف" شامل ہے پروفیسر آلِ احمد سرور (سکریٹری انجمن ترقّیِ اردو ہند) کا لکھا ہوا۔ اُن دنوں مالک رام صاحب ہندستان میں نہیں تھے، یوں بڑی ذمّے داری ناشر کی تھی کہ وہ یہ دیکھتا کہ ایک شخص کی زندگی بھر کی محنت بہ یک جنبشِ قلم دوسرے شخص کے کھاتے میں نہ چلی جائے۔ مرتّبِ اصلی مہیش پرشاد کا "دیباچہ" شامل ہے، مگر ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کا بہت عمدہ اور ضروری "مقدّمہ" نکال دیا گیا (جو اصل نسخے میں شامل ہے)۔ بے انصافی کی شاید یہ سب سے "بہتر" مثال ہے جو ایک علمی ادارے کی سرپرستی میں پیش کی گئی ہے۔

مہیش پرشاد نے خطوطِ غالب کی دوسری جلد بھی مرتّب کر لی تھی۔ پہلی جلد کے مقدّمے میں دو اندراجات ایسے ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد مکمّل طور پر مرتّب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے مقدّمے کے پہلے ہی صفحے پر یہ اطلاع ملتی ہے کہ "پہلی جلد اب شائع ہو رہی ہے اور امید ہے کہ دوسری جلد کا چھاپا بھی اِسی سال ہو جائے"۔ اِسی دوران مہیش پرشاد کا انتقال ہو گیا۔ غالب سے متعلق اُن کے سب کاغذات "انجمن ترقّیِ اُردو ہند نے خرید لیے" (سرور صاحب) اُس میں بہت سے اصل خطوں کے ساتھ دوسری جلد بھی تھی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ دوسری جلد کا مسوّدہ گم ہو گیا۔ یہ کیسی پُر حسرت اور اندوہ ناک بات ہے کہ دوسری جلد اصل مرتّب کے نام سے شائع نہ ہو سکی؛ اور پہلی جلد سے بھی اصل مرتّب کو بے دخل کر دیا گیا۔ (مگر سارے قرائن واضح طور پر بتاتے ہیں کہ دوسری جلد کا مسوّدہ گم نہیں ہوا تھا، اُسے "گم شدہ" مشہور کیا گیا)۔

۱۔ اشاعتِ اوّل میرے سامنے نہیں، اِس کی چھٹی اشاعت (۱۹۴۹ء) پیشِ نظر ہے۔ پہلی اشاعت کا سنہ اِسی موخر اشاعت کے اندراج سے ماخوذ ہے۔

اِس مجموعے میں شامل ہیں۔ مرزا صاحب کی بعض اور تحریروں کے عکس بھی ہیں۔ جتنے عکس اِس مجموعے میں شامل ہیں، اُن کے لیے بہ طورِ عموم اِسی مجموعے کا حوالہ دیا گیا ہے، یوں کہ اُن سب تحریروں کے عکس کے لیے اِس مجموعے کی حیثیت ماخذِ اوّل کی ہے۔ (پرتھوی چندر (مرحوم) سے مجھے شرفِ ملاقات حاصل رہا ہے۔ ادبیات سے اُن کا تعلق دور کا تھا؛ مگر غالبؔ کے عاشق تھے، سچّے عاشق۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جن کے لیے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے: اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں)۔

۳۔ علی گڑھ میگزین غالبؔ نمبر، ۴۹۔۱۹۴۸ء۔ اڈیٹر: (پروفیسر) مختارالدّین احمد آرزوؔ۔ اِس میں مرزا صاحب کے سات خطوں کے عکس ہیں۔ دستنبوؔ کے دو صفحوں کا عکس ہے، جن میں سے ایک صفحہ جو دستنبوؔ کا سرورق ہے (بہ قولِ مدیر) بہ خطِ غالبؔ ہے اور دوسرے صفحے پر بعض الفاظ کے معنی بہ خطِ غالبؔ ہیں۔ دو عکس غالبؔ کے فارسی کلّیات کے ایک قلمی نسخے کے حواشی پر مندرج عبارتوں کے ہیں (جو بہ قولِ مدیر) بہ خطِ غالبؔ ہیں۔

خطوں میں سب سے طویل اور اہم خط بہ نامِ مولوی ضیاءالدّین خاں دہلوی ہے۔ ایک رقعہ ہے اور وہ بھی (بہ ظنِ غالب) اُنھی کے نام ہے۔ دو خط حسین مرزا کے نام ہیں۔ ''اِن دونوں خطوں کے مکتوب الیہ معین الدّولہ ذوالفقارالدّین حیدر خاں، معروف بہ حسین مرزا ہیں، جو بہادر شاہ کے ناظر تھے۔ اِن کے نام اردوے معلّیٰ میں کئی خط ہیں'' (مدیر)۔ مدیر نے وضاحت کردی ہے کہ یہ چاروں خط اُن کو ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی سے ملے تھے۔ مدیر نے یہ وضاحت نہیں کی کہ اُن کو اصل خط ملے تھے یا اصل خطوں کے عکس ملے تھے۔ خطوطِ غالب میں شامل ڈاکٹر صدّیقی کے مقدّمے اور اُن کے طویل مقالے بہ عنوان ''کچھ اور بکھرے ورق'' (رسالہ ہندستانی (الٰہ آباد) ۱۹۳۴ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اصل خط اُن کے سامنے تھے اور (غالباً) خطوطِ غالب کی دوسری جلد میں شامل تھے۔ اب نہیں

معلوم کہ یہ اصل خط کہاں ہیں۔

ایک خط بہ نامِ یوسف علی خاں عزیز ہے۔ایک فارسی خط جو دراصل دستاویز ہے؛ خدادادخاں، ولی دادخاں کے نام ہے، جو بہ قولِ مدیر ''آگرے میں رہتے تھے اور مہاجنی کا کام کرتے تھے''۔ایک خط قدر بلگرامی کے نام ہے۔اِن آخری دو خطوں کے عکس اس قدر دُھندلے ہیں کہ اچھی طرح پڑھنے میں نہیں آتے۔فارسی والے دستاویزی خط کا عکس آج کل (نئی دہلی) کے غالب نمبر ۱۹۵۲ء میں بھی شائع ہوا ہے اور میں نے اُسی سے استفادہ کیا ہے، کہ اُس میں عبارت پوری طرح خوانا ہے۔ قدر بلگرامی کے نام خط کا متن خطوطِ غالب میں شامل ہے (ص ۱۹۶) اور میں نے اُسی کی مدد سے اِس عکس سے استفادہ کیا ہے۔ہاں اُس دستاویزی خط کا عکس فسانۂ غالب (مجموعۂ مضامینِ مالک رام) میں بھی شامل ہے۔اِس خط کی تاریخِ کتابت سے متعلق وہاں جو کچھ لکھا گیا ہے، میں نے اُس سے بھی استفادہ کیا ہے۔یہ اصل خط مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے (فسانۂ غالب، ص ۳۳)۔

۴۔ غالب کے خطوط، مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم، چار جلدیں۔ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی: ۹۳-۱۹۸۴ء۔مرزا صاحب کے اُردو خطوں کے دست یاب عکس بھی، خطوں کے متن کے ساتھ اِس مجموعے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔اِس طرح سارے بکھرے ہوئے عکس یک جا ہو گئے ہیں۔مرزا صاحب کے اُردو خطوں کے عکس کا یہ سب سے بڑا مجموعہ ہے اور اِس لحاظ سے اِس کی بڑی اہمیّت ہے۔اگر یہ میرے سامنے نہ ہوتا، تو میں بہت سے خطوں کے عکس سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔چوں کہ یہ موخر مجموعہ ہے، اِس لیے اِس کا حوالہ اُنھی خطوں کے عکس کے تحت دیا گیا ہے، جو اِس سے مقدّم ماخذ میں نہیں مل سکے، یعنی وہ ماخذ نہیں مل سکے۔

۵۔ نامہ ہای فارسیِ غالب، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی۔غالب اکیڈمی، دہلی، ۱۹۶۹ء۔

یہ کتاب فی الوقت پیشِ نظر نہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے مطلع کیا ہے کہ اِس میں مرزا صاحب کی فارسی کی ایک دستی تحریر کا عکس شامل ہے۔ اُس عکس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اُنھوں نے بھیج دی تھی، وہی پیشِ نظر ہے۔ یہ مرزا صاحب کی پنشن کے قضیے کے سلسلے کی عرضی ہے جو اُنھوں نے فریزر کے سامنے پیش کی تھی۔ اِس میں متعدد انگریزی لفظ آئے ہیں۔

٦۔ آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر، فروری ١٩٥٢ء۔ اِس میں مولوی نعمان احمد[1] کے نام مرزا صاحب کے دو اُردو خطوں کا عکس شامل ہے۔ ایک فارسی خط (دستاویز) کا عکس ہے جو خدا داد خاں، ولی داد خاں کے نام ہے۔ اِس کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ رضا لائبریری میں محفوظ دستنبو کے ایک نسخے کے آخری صفحے کا عکس ہے ''جس کے حاشیے پر خود غالب کے قلم کا نوٹ ہے''۔ ایک فارسی قطعے کا عکس ہے جو مقالہ نگار سیّد منظور الحسن برکاتی (ٹونک) کے قول کے مطابق کتب خانہ وزیریہ (ٹونک) میں محفوظ دستنبو کے ''سرورق کے دوسرے صفحے پر خود مرزا غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے'' (قطعہ یہ ہے: نذرِ نوّاب وزیر الدولہ: آں محیطِ کرم و دانش و داد، ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید۔ غالبِ خستہ کہ رفتست زیاد)۔ دیوانِ غالب فارسی کے ایک صفحے کا عکس ''جس میں بین السطور کے اندر غالب نے اپنے قلم سے ایک رباعی لکھی ہے'' (مخزونہ رضا لائبریری رامپور)۔

٧۔ آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر، فروری ١٩٦٥ء۔ اِس کے ایک صفحے کا عکس ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھیجا ہے۔ اِس میں غلام نجف خاں کے نام مرزا صاحب کے خط کا عکس

١۔ مولوی نعمان احمد ضلع سیتاپور (یو۔پی) کے علاقے مہیوا کے تعلقے دار تھے۔ اِن کے نام مرزا صاحب کے چار اُردو خط، معروف نقاد احتشام حسین صاحب نے ایک مضمون میں پیش کیے تھے۔ مضمون میں متن تو چاروں خطوں کا ہے، مگر عکس صرف دو خطوں کا ہے۔ اڈیٹر نے یہ لکھا ہے کہ: ''خطوں کے عکس اچھے نہیں تھے، اُن میں سے صرف دو شائع ہو سکے''۔ غالب کے خطوط میں اُن چاروں خطوں کا صاف اور واضح عکس شامل ہے۔ اصل خط بہ قولِ ڈاکٹر خلیق انجم اب انڈیا آفس لائبریری، لندن میں ہیں۔

ہے (آغاز: ''لو صاحب یہ پندرہ بیتیں ہیں تقسیم اس کی اِسی طرح رکھنا کہ...)۔ایک فارسی قطعے بہ خطِ غالب کا عکس ہے (پہلا شعر: امین ملک و ممالک معظم الدولہ۔۔امیر شاہ نشان و کریم ابر نوال)۔ یہ دونوں چیزیں نقوش (لاہور) کے خطوط نمبر کی پہلی جلد میں بھی بعد کو شائع ہوئی ہیں۔

۸۔ نقوش (لاہور) خطوط نمبر، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء۔ اِس کی پہلی جلد میں مرزا صاحب کے دو فارسی خطوں کے اور دس اُردو خطوں کے عکس شائع ہوئے ہیں۔ایک فارسی قطعہ ہے (جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے) کچھ اور متفرق اور مختصر اصلاحی تحریریں بھی ہیں جنون بریلوی کے کلام سے متعلق۔ اِس میں شامل کئی تحریروں کے عکس اِس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

۹۔ مرزا صاحب کے ایک خط بہ نامِ علائی کا عکس اور ایک فارسی قصیدے کے حاشیے پر[1] مرزا صاحب کی تحریر کا عکس ممبئی سے کالی داس گپتا رضا صاحب نے بھیجا ہے۔(علائی کے نام خط کا آغاز: ''صاحب آگ برستی ہے کیوں کر آگ میں گر پڑوں''۔اِس خط کا عکس غالب کے خطوط میں شامل ہے)۔

۱۰۔ ہندستانی (الٰہ آباد) ۳۴-۱۹۳۳ء۔ اِس رسالے کے دو مختلف شماروں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ایک طویل مقالہ دو قسطوں میں شائع ہوا تھا، جس میں غالب کے کچھ نو دریافت خطوں کا متن پیش کیا گیا تھا اور معدد خطوں کے عکس بھی شائع کیے گئے

۱۔ یہ تحریر جو چار سطروں پر مشتمل ہے، قصیدے کے اِس شعر سے متعلق ہے:

آں از نعم، آوازۂ انکار در افگند   ایں را ز بلیٰ معنیِ اقرار برآمد

(اصل ورق پر جا بہ جا چیپیاں لگائی گئی ہیں، یوں بعض لفظ دب گئے ہیں) ''چوں ایں... یافت مولوی امام بخش صہبائی پیش معتقدان خویش..... خندید و گفت افسوس کہ غالب عربی نمیداند واز نعم معنی انکار افادہ میکند حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنی است مولوی آل نبی یکے از یاران غالب عبارت شرح ملا کہ رفع ایں وسوسہ میکرد بوے نمود و گفت غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدہ سوال از جانب حق اینست الست بربکم آیا هستم پروردگار شما و ایں کلمہ استفہامیہ است کفار گفتند ہاں نیستی خداے ما مومناں گفتند ہاں ہستی خداے ما آں تسلیم انکار است و ایں تسلیم اقرار مولوی چوں خر در وحل فرو ماند''۔

تھے۔ پہلی قسط کا عنوان تھا: بکھرے ورق۔ دوسری قسط کا عنوان ہے: کچھ اور بکھرے ورق۔ پہلی قسط جس شمارے میں شائع ہوئی تھی، وہ مجھے نہیں مل سکا، اب سے چار پانچ برس پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اب اُس کے مندرجات ذہن میں نہیں۔ دوسری قسط پیشِ نظر ہے۔ اِن دونوں قسطوں میں خطوں کے جو عکس شامل ہیں، وہ پہلی بار سامنے آئے تھے۔ اصل خط ڈاکٹر صدّیقی اور مہیش پرشاد کے پاس تھے اور یقین ہے کہ وہ سب دوسری جلد کے کاغذوں میں شامل ہوں گے (جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُس جلد کے سارے کاغذات گم ہو گئے۔ لفظ ''لگاو'' کے تحت حصّہ اوّل میں مولوی ضیاء الدّین خاں دہلوی کے مکتوب کے حوالے سے اِس کا کچھ ذکر کیا گیا ہے، اُسے دیکھا جائے)۔

املا سے متعلق مرزا صاحب کے اقوال اور مثالیہ اشعار کے لیے مندرجۂ ذیل ماخذ پیشِ نظر رہے ہیں:

۱۔ قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود۔ سالِ طبع: ۱۹۶۷ء۔ حوالوں میں اِس کے لیے بہ طورِ نشان قاطع لکھا گیا ہے۔

۲۔ مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، طبعِ ششم۔ سالِ طبع: ۱۹۴۹ء۔

۳۔ خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد، سالِ طبع: ۱۹۴۱ء۔

۴۔ ادبی خطوطِ غالب، مرتبہ مرزا محمد عسکری۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ سالِ طبع: ۱۹۲۹ء۔

۵۔ فرہنگِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، سالِ طبع: ۱۹۴۷ء۔ (اِس کتاب کا جو نسخہ میرے پاس ہے، اُس میں سرورق نہیں۔ سالِ طبع نذرِ عرشی میں شامل تفصیلِ مطبوعاتِ عرشی صاحب سے ماخوذ ہے)۔

۶۔ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، طبعِ اوّل، ۱۹۵۸ء۔ ناشر: انجمن ترقّیِ اردو (ہند) علی گڑھ۔

۷۔ انتخابِ غالب، مرتبہ مولانا عرشی، ''مطبعہ قیمہ، بمبئی'' سالِ طبع: ۱۹۴۲ء۔

۸۔ دیوانِ غالب کامل، مرتبہ کالی داس گپتا رضا۔ سالِ طبع: ۱۹۹۵ء۔

۹۔ پنج آہنگ، تصنیف: مرزا غالب۔ تقدیم: ڈاکٹر حنیف نقوی۔ ناشر: خدا بخش اورینٹل

پبلک لائبریری، پٹنہ۔ سالِ طبع: ۱۹۹۷ء۔ (نقوی صاحب نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی اِس کتاب کا مکمّل اور قدیم ترین خطّی نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی لائبریری کے ذخیرۂ لالہ سری رام دہلوی میں ہے۔ اُسی نسخے کو مفصّل مقدّمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ میں نے دوسرے مطبوعہ نسخوں پر اِس نسخے کو ترجیح دی ہے)۔

۱۰۔ دیوانِ غالب نسخہ لاہور: پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتاب خانے میں دیوانِ غالب کا ایک اہم خطّی نسخہ تھا۔ قاضی عبدالودود نے اِس سے متعلق ایک تعارفی مضمون لکھا تھا [نقوش (لاہور) اکتوبر ۱۹۵۸ء] مولانا عرشی نے بھی اپنے مرتّبہ نسخہ دیوانِ غالب کے مقدّمے میں اِس کا تعارف کرایا ہے (ص ۸۴)۔ اِس نسخے کی فوٹو کاپی اُن کو قاضی صاحب نے لاکر دی تھی (ایضاً ص ۱۲۰)۔ مولانا عرشی کی یہ راے ہے کہ اِس نسخے کی کتابت نوّاب فخر الدّین محمد خاں کی ہے، جو مرزا غالب کے پسندیدہ کاتب تھے۔ یہ نسخہ مختلف اعتبارات سے اہم ہے، خاص بات یہ بھی ہے کہ کاتب نے اکثر صورتوں میں مرزا صاحب کے اندازِ کتابت کی پیروی کی ہے۔ اب سے پہلے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہ نسخہ غائب ہو گیا۔ بارے، وہ خطّی نسخہ کسی طرح ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس آگیا اور انھوں نے اُسے بہت اہتمام کے ساتھ ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ معین صاحب نے اچھا کیا کہ اُس اہم خطّی نسخے کو عکسی صورت میں شائع کیا ہے، اِس طرح کہ ایک صفحے پر اصل نسخے کا عکس ہے اور صفحۂ مقابل پر بہ خطِّ کاتب ہے (جس کی مطلق ضرورت نہیں تھی)۔ اِس نسخے سے بعض ایسے قیمتی حوالے میرے کام میں معین ثابت ہوئے ہیں جو کسی اور طرح مجھے نہیں مل سکتے تھے۔ اِس کا حوالہ ''نسخہ لاہور'' کے نام سے دیا گیا ہے (یوں کہ اِسے ''نسخہ خواجہ'' کہنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا)۔

دو وضاحتیں: (۱) نسخہ بھوپال، یا نسخہ امروہہ یا نسخہ عرشی زادہ کے نام سے مرزا صاحب کا جو خود نوشت دیوانِ اُردو شائع ہوا ہے عکسی صورت میں، اُس کو بہ طورِ ماخذ استعمال نہیں کیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرزا صاحب کی ابتداے جوانی کے زمانے کی تحریر ہے اور ہم بھی اِس بات سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایسے معاملات و مسائل کے لیے بہ طورِ عموم یہ پختگی کا زمانہ نہیں ہوتا۔ قطعی اور واضح نقوش کی تشکیل ذرا دیر میں ہو پاتی ہے۔ اِس بنا پر اِس عمر کی تحریر کو املا کی بحثوں

میں بنیاد بنانا اور بہ طورِ ماخذ اُن سے کام لینا مناسب نہیں۔ املا کے بہت سے مسائل، جن پر آگے چل کر اُنھوں نے بہت اصرار کیا، اُس وقت تک اُن کے ذہن میں یا تو آئے ہی نہیں تھے، یا ایسے کم تاب نقش تھے جن پر نظر دیر تک نہیں ٹھہر پاتی تھی۔ اس نسخے کے ایک مرتب اکبر علی خان کے الفاظ میں:

> ''غالب فارسی الفاظ میں ذال اور طوے کے قائل نہ تھے، لیکن اُن کا یہ نظریہ نسخہ عرشی زادہ کی کتابت کے بعد کا ہے؛ اِس لیے نسخہ عرشی زادہ میں گذر، گذرگاہ، گذشتن وغیرہ الفاظ کو ذال سے لکھا ہے، زے سے نہیں لکھا۔ تپیدن کے تمام مشتقات کو..... بالعموم طوے سے لکھا ہے، مگر دو ایک مثالوں میں اِس کے خلاف ت لکھی گئی ہے... غالب ''خورشید'' کو بہ حذفِ واو لکھنے کے قائل تھے، مگر نسخہ عرشی زادہ کے بعد یہ عقیدہ اختیار کیا تھا، اِس لیے کہ اِس میں واو موجود ہے۔ (دیوانِ غالب، نسخہ عرشی، طبع دوم، ص ۴۶۳)۔

(۲) فارسی اشعار کی مثالیں صرف انتخابِ غالب، مرتبہ عرشی صاحب سے لی گئی ہیں؛ اِس بنا پر کہ یہ عرشی صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے، یوں اِس کی حیثیت دیگر مطبوعہ نسخوں سے الگ ہے۔ کلیاتِ فارسی کی اشاعتِ اوّل (مطبعِ دارالسّلام، دہلی ۱۸۴۵ء) پیشِ نظر رہی ہے، مگر اِسی وجہ سے اُسے اِس بحث میں بہ طورِ ماخذ شامل نہیں کیا گیا۔

توقّع کی جاتی ہے کہ اِس کتاب سے املاے غالب سے متعلق مسائل کو سمجھنے میں اور کلامِ غالب کی تدوین میں مدد مل سکے گی، اور لفظوں کے صحیح تر نقوش کلامِ غالب میں بن سکیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ الفاظ دورنگیِ املا سے محفوظ رہ سکیں گے اور کلامِ غالب میں الفاظ کو اُس طرح لکھا جا سکے گا کہ وہ مرزا صاحب کی توضیحات کے خلاف نہ ہوں۔

جناب کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر حنیف نقوی کا بہ طورِ خاص شکر گزار ہوں کہ اِن حضرات نے متعلقہ ماٰخذ کی فراہمی میں مدد کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی صاحب

کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اِس کتاب کی ترتیب پر اصرار کیا اور اس کی مشینی کتابت اور طباعت کی نگرانی کی ذمے داری قبول کی۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ کتاب بہتر طور پر چھپ سکے گی۔

رشید حسن خاں

۱۰؍دسمبر ۱۹۹۹ء

پہلا حصّہ

الفاظ کا گوشوارہ

آدر: مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ فارسی حروفِ تہجی میں ذال شامل نہیں؛ اسی بنا پر وہ فارسی الاصل لفظوں میں ذال لکھنے کو غلط سمجھتے تھے۔ ''آدر'' فارسی کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: آگ۔ صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''آدر: اسمِ آتش، بہ دالِ ابجد ہے، نہ بہ ذالِ ثخذ'' (ادبی خطوطِ غالب، ص ۲۵)۔ قاطعِ برہان میں لکھا ہے: ''آدر، آتش را گویند.... آذر بہ ذالِ منقوطہ زنہار نیست'' (قاطع، ص ۱۴)۔

مرزا صاحب کی اس وضاحت کی بنا پر، اُن کی اُردو فارسی تحریروں میں آگ کے معنی میں ''آدر'' لکھنا چاہیے، ''آذر'' لکھنا درست نہیں ہوگا۔ دو مثالوں سے اس کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ دیوانِ غالب نسخہ عرشی میں ص ۱۸۸ پر یہ شعر ہے:

ہے تنگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں

''آذرفشاں'' چھپا ہوا ہے، ''آدرفشاں'' ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح یہ شعر:

آگ کا آتش اور آذر نام ہے اور انگارے کا اخگر نام ہے

(ایضاً، ص ۲۶۹)

''آدر نام ہے'' لکھا جانا چاہیے تھا۔ اس شعر سے متعلق نسخہ عرشی کے ضمیمہ اختلافِ نسخ میں لکھا گیا ہے:

''نسخہ دہلی و کان پور دونوں میں ذالِ منقوط ہے، مگر یہ غالب کی تصریح کے خلاف ہے'' (۴۶۶)۔ اس صراحت کے بعد تو خاص طور پر اس شعر میں ''آذر'' نہیں لکھا جانا چاہیے تھا، ''آدر'' ہونا چاہیے تھا۔ ہاں انتخابِ غالب کے اس شعر میں ''آدر'' ہی ہے:

آدر پرستیم و رُخ از شعلہ نتابیم
اے خواندہ بسوے خود ازیں راہگزر ماں

(ص ۱۴۹)

آرایش، آرایشی (وغیرہ): میر مہدی مجروحؔ کے نام خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

''امر کے صیغے کے آگے شین آتا ہے، تو وہ امر معنیِ مصدری دیتا ہے اور اُس کو ''حاصل بالمصدر'' کہتے ہیں۔ سوختن مصدر، سوزد مضارع، سوزش حاصل بالمصدر۔ اِسی طرح آرایش و پیرایش و فرمایش۔ مصدرِ اصلی فرمودن ہے۔ فرماید مضارع، فرمائے امر، حاصل مصدر فرمایش'' (خطوطِ غالب، ص ۲۵۴)۔

پہلے یہ وضاحت کردی جائے کہ مرزا صاحب ''فہمایش'' کو صحیح نہیں سمجھتے تھے: اِس خط میں اُنھوں نے اِسی لفظ (فہمایش) کے ذیل میں یہ سب مثالیں لکھی ہیں۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ مصدر ہے فہمیدن، اِس کا امر ''فہم''، اُس سے ''فہمایش'' کیسے بنے گا۔ اگر امر ''فہمائے'' ہوتا، تب شین کے اضافے سے ''فہمایش'' بن سکتا تھا۔

اِس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ (بہ قولِ غالبؔ) جن مصدروں کے فعلِ مضارع میں آخری حرف دال سے پہلے ی ہوتی ہے، (جیسے: نماید، آراید) اُن سے بننے والے فعلِ امر کے آخر میں وہی ی آتی ہے۔ جیسے آراستن کا مضارع ''آراید'' ہے، اُس کا امر ''آرائے'' ہے، اُس سے حاصل مصدر (بہ اضافۂ شین) ''آرایش'' بنے گا۔ اِسی طرح نمایش، آسایش وغیرہ۔ اِس طرح یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ایسے حاصل مصدروں میں شین سے پہلے ی لکھی جائے گی، اُس کی جگہ ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ یعنی نمائش، آرائش وغیرہ لکھنا درست نہیں ہوگا۔

ایسے حاصل مصدروں میں شین کے بعد ی کے اضافے سے اسمِ مصدر اور اسمِ نسبت بنتے ہیں، مثلاً: آرایشی، نمایشی، فرمایشی، آزمایشی (وغیرہ) ہمزہ اِن میں بھی نہیں آئے گا۔ ایسے حاصل مصدروں سے لاحقوں کے اضافے سے جو دوسرے لفظ بنیں گے، جیسے: نمایش گاہ، ستایش گر (وغیرہ) ہمزہ اُن میں بھی نہیں آئے گا۔

مرزا صاحب نے ایسے سبھی لفظوں کو خود بھی اِسی طرح لکھا ہے اور یہ اُن کا عام انداز ہے، اس لیے اِس سلسلے میں زیادہ مثالیں پیش کرنا کچھ ضروری نہیں۔ محض وضاحت کی تکمیل کے

لیے بس چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں: ''میں قابل ستایش کے نہیں ہوں'' (مکتوب بہ نامِ مولانا عبّاس رفعت۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۳۱۷)۔ ''یہ جملہ محض آرایشِ عنوانِ نامہ ہے'' (مکتوب بہ نامِ نعیم الحق آزاد۔ عکس: ایضاً ص ۱۷۲۵)۔ ''کثرتِ مشق .... و پیرویِ راہروانِ راہ داں کشایش ہا روے خواہد نمود'' (مکتوب بہ نامِ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۲)۔ ''بے اندازہ ستایش...سوے کلک و کاغذ گرایش دارد'' (مکتوب بہ نامِ مولانا عبّاس رفعت۔ اصل خط: مخزونۂ غالب میوزیم، ایوانِ غالب، نئی دہلی۔ عکس فرستادۂ ڈاکٹر حنیف نقوی)۔ ''نمایشگاہِ سراسر سورِ رام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۶۷)۔ نمایشگہے درخورِ شانِ خویش (ایضاً)۔ ''نمایشگاہِ بریلی'' (مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۸)۔

نسخہ عرشی میں ایسے جملہ الفاظ کو صحیح طور پر لکھا گیا ہے۔ میں بہت سی مثالوں میں سے صرف چند مثالیں نقل کرتا ہوں: اسد![1] اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرایش (ص ۷۹) کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا (ص ۱۴۳)۔ فکر اچھی، پر ستایش نا تمام (۱۴۱)۔ کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں وہ بھی (۲۰۲)۔ جہاں مٹ جائے سعیِ دیدِ خضر آبادِ آسایش (ص ۱۶)۔

آزر: اِس لفظ میں مسلّمہ طور پر ز ہے۔ حضرت ابراہیم کے والد یا چچا کا نام تھا جو بُت تراش تھے۔ اِسی نسبت سے ''بُت خانۂ آزر'' آتا ہے، جو مرزا صاحب کے اِس شعر میں آیا ہے:

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب　　تو کہے، بت خانۂ آزر کھلا

دیوانِ غالب نسخہ عرشی کی اشاعتِ اوّل میں ''بُت خانۂ آذر'' ہے (ص ۱۳۹) مگر اشاعتِ ثانی میں (صحیح طور پر) ''بُت خانۂ آزر'' ہے (ص ۱۵۶)۔ مرزا صاحب کا معروف شعر ہے:

بامن میاویز اے پدر، فرزندِ آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

۱۔ اِس شعر کے دونوں مصرعے درج کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا:
اسد! اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرایش　　لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

اِس شعر کو بہت سے تنقیدی مضامین میں نقل کیا گیا ہے اور بعض مضامین میں (مضمون نگار کی کم آگہی، یا کتابت کی متعارف غلط پسندی کے نتیجے میں) ''فرزندِ آذر'' دیکھنے میں آیا ہے، جو قطعی طور پر غلط املا ہے۔ یہی احوال اِس معروف شعر کا ہے:

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری | در دلِ سنگ بنگر د رقصِ بتانِ آزری

(انتخابِ غالب، ص ۱۷۴)

''آزر'' مرزا صاحب کی صرف ایک دستی تحریر میں ملا ہے۔ نواب علاء الدین خاں علائی کے نام جس خط میں مرزا صاحب نے کئی غزلیں لکھی ہیں، اُن میں کی ایک غزل[۱] میں یہ شعر بھی ہے:

''پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند | ہموارہ تراشد بت و آزر نتواں گفت''

(عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۸۹)۔

''آزر'' ایک ایرانی مہینے کا نام بھی ہے۔ یہ اِس جملے میں آیا ہے: ''دے و بہمن بہت دور ہے، آبان و آزر میں بہ شرطِ حیات قصد کروں گا'' (مکتوب بہ نامِ علائی۔ عکس: فرستادہٴ جناب کالی داس گپتا رضا۔ اِس خط کا عکس غالب کے خطوط میں بھی شامل ہے)۔

آئنہ (آینہ) آئینہ: مقدمہٴ مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے لکھا ہے: ''لفظِ آئینہ جب فاعلن کے وزن پر باندھا ہے، تو اُسے ''آینہ'' لکھا ہے، ''آئنہ'' نہیں لکھا اور یہی املا ناظم کو بتایا ہے'' (ص ۲۳۱)۔

عرشی صاحب نے حوالہ نہیں دیا کہ اُن کا یہ قول مرزا صاحب کی کس تحریر یا کس اصلاح پر مبنی ہے۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے جو عکس پیشِ نظر ہیں، بہ شمولِ خطوط بہ نامِ نواب ناظم، اُن میں سے کسی تحریر میں ایسی کوئی بات مندرج نہیں۔ آئینہ یا آئنہ کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ مکاتیبِ غالب کے مقدمے یا حواشی میں اور مقدمہ دیوانِ غالب نسخہ عرشی میں یا اُس کے حواشی میں بھی، اُن کے اِس زیرِ بحث قول کے علاوہ، ایسی کوئی صراحت مجھے نہیں ملی۔

۱۔ یہ وہی غزل ہے، جس میں یہ بلیغ شعر بھی ہے:

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم | با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

دوسری طرف، خود عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں ہر جگہ ''آئنہ'' لکھا ہے۔ اِس نسخے کے شروع کے دس صفحات کا جو میں نے جائزہ لیا، تو اُن میں یہ لفظ گیارہ مصرعوں میں آیا ہے اور ہر جگہ ''آئنہ'' لکھا ہوا ہے: ص ۳، ۴، ۴، ۵، ۵، ۶، ۶، ۶، ۷، ۸، ۸۔ شروع کے دو مصرعے نقل کیے جاتے ہیں:

زانوے آئنہ پر مارے ہے دستِ بیکار (ص ۳)

نگہِ آئنہ کیفیتِ دل سے ہے دوچار (ص ۴)

(اِن دس صفحوں کے بارہ مصرعوں میں ''آئینہ'' ملتا ہے، ی سے پہلے ہمزہ)۔

اِسی طرح انتخابِ غالب میں (کہ یہ بھی اُنھی کا مرتب کیا ہوا ہے) اُردو فارسی کے اٹھارہ مصرعوں میں ''آئنہ'' ہے: ص ۸، ۱۷، ۲۹، ۳۰، ۳۰، ۴۴، ۵۹، ۶۲، ۷۱، ۸۴، ۸۴، ۱۰۰، ۱۲۵، ۱۵۸، ۱۵۸، ۱۵۸، ۱۵۹، ۲۶۱۔ (اِن میں سے شروع کے دو مصرعوں میں ''آئینہ'' چھپا ہوا ہے (ص ۸۔ ۱۷) یہ واضح طور پر کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ باقی سب مصرعوں میں ایسی کوئی غلطی نہیں، ہر جگہ ''آئنہ'' ہے)۔

اِس سلسلے میں ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے۔ مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے صاحب زادہ عباس علی خاں بیتاب رام پوری کے بہت سے اشعار پر مرزا صاحب کی اصلاحیں بھی شامل کی ہیں۔ اُس حصّے میں ایک شعر ایسا بھی ہے جس میں ردیف ''آئنہ'' ہے۔ شعر یہ ہے:

خانۂ آئینہ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی
دیکھ رکھ دیتا ہے جب وہ مہ شمائل آئنہ

عرشی صاحب کی صراحت کے مطابق، مرزا صاحب نے اِس شعر میں بس ایک جگہ دخل دیا ہے۔ صرف یہ اصلاح کی ہے کہ ''دیکھ رکھ دیتا'' کو قلم زد کرکے، اُس کی جگہ ''دیکھ کر رکھتا'' لکھ دیا۔ پہلے مصرعے کا ''آئینہ'' اور دوسرے مصرعے میں ''آئنہ'' اُسی طرح برقرار رہا ہے؛ یعنی مرزا صاحب نے آئنہ'' کو اصلاح طلب نہیں سمجھا۔

''آئنہ'' مجھے مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں نہیں ملا (لیکن ایک مطلعے میں یہ اِس طرح آیا ہے کہ املا کا تعین بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ اِس کا حوالہ ذرا آگے چل کر آئے گا)۔ اصل لفظ ''آئینہ'' کی ایک مثال پیشِ نظر ہے۔ مرزا صاحب کے ایک قصیدہ نما قطعے کے اِس شعر میں یہ آیا ہے:

کدام نیّرِ رخشاں کہ خود زمنظرِ او　　پدید گشتہ در آئینۂ فلک تمثال

یہ قطعہ ''فرزندار جمند سلطانی بارنٹ تامس سافلس مٹکف صاحب بہادر'' (ٹامس مٹکاف) کی مدح میں ہے۔ (عکس: آج کل (نئی دہلی)، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۵ء)۔

اصل لفظ ''آئینہ'' ہے۔ ہندستانی فارسی اور کلاسکی فارسی میں اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جاتا رہا ہے (ہمزہ ماقبلِ ی) اور مرزا صاحب نے بھی اپنے قلم سے اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا ہے۔ اِس میں جب تخفیف کا عمل کارفرما ہوگا، تو معمول کے مطابق ی ساقط ہو جائے گی، جو ساکن ہے۔ اِس طرح ''آئینہ'' کا مخفف ''آئنہ'' ہوگا۔ (جدید فارسی میں ''آیینہ'' ہے (فرہنگِ فارسی) ظاہر ہے کہ اِس کا مخفف ''آینہ'' ہوگا (فرہنگِ فارسی)۔

اِسی قماش کا ایک لفظ ہے ''ہرآئنہ''، جو ''ہرآئینہ'' کی مخفف صورت ہے۔ اِسے بھی مرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ہرآئینہ'' لکھا ہے۔ اِس کی کئی مثالیں میرے سامنے ہیں: ''ہرآئینہ ہرچہ پس ازوے بہ پیشگاہِ پیدائی شتابد'' (سندِ جانشینی بہ نامِ علائی، عکس: مرقعِ غالب)۔ ''و ہرآئینہ نقلِ آں رپوٹ و کیفیتِ منظوریِ آں در دفتر خانۂ کلکتہ خواہد بود'' [عرضیِ مرزا غالب (بہ خطِ غالب) عکس: نامہ ہای فارسیِ غالب]۔ ''و اگر گویند ہست، ہرآئینہ میتوانیم گفت کہ نیست'' (مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی، عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل)۔

''ہرآئینہ'' کا مخفف ''ہرآئنہ'' ہے۔ یہ مرزا صاحب کے اِس مطلعے میں بہ طورِ قافیہ آیا ہے:

گاہے بہ چشمِ دشمن و گاہے در آئنہ
پر کارِ عیب جوئیِ خویشم ہرآئنہ

(انتخابِ غالب، ص ۱۵۸)

اِس لفظ ''ہرآئنہ'' کے ذیل میں چار حوالے توجہ طلب ہیں۔ خطوطِ غالب میں شامل ایک مکتوب بہ نامِ مجروح میں ایک جگہ یہ لفظ آیا ہے اور وہاں اِسے ''ہر آینہ'' لکھا گیا ہے: ''ہر آینہ متاخرین نے اِس قاعدے کو پسند کیا'' (ص ۲۸۸)۔ انتخابِ غالب میں شامل تین اشعار میں یہ لفظ آیا ہے اور اِس میں دو جگہ ''ہر آئنہ'' ہے اور ایک جگہ ''ہر آینہ'':

بایدز مے ہر آینہ پرہیز، گفتہ اند　　آرے، دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

(ص ۸۲)

تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکشِ حقست　　اما کشادِ آں زکمانِ محمدست

(ص ۳۰)

گاہے بہ چشمِ دشمن و گاہے در آئنہ　　پرکارِ عیب جوئیِ خویشم ہر آئنہ

(ص ۱۵۸)

ہر جگہ ''ہر آئنہ'' لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہاں ضمنی طور پر اِس طرف توجہ دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اِس لفظ کے املا میں یہ دورنگی اِسی لیے پیدا ہوئی کہ اہم الفاظ کا بہ لحاظِ املا گوشوارہ نہیں بنایا گیا تھا۔

آئین: ''خداوند آئینِ بندہ پروری بھول نہ جاؤ'' (مکتوب بہ نامِ نعیم الحق آزاد۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۲۵ے)۔ ''آئینِ گفتار بہ تنومنویِ اندیشہ آں نوجوان'' (سندِ جانشینی بہ نامِ علائی۔ عکس: مرقعِ غالب)۔ ''میں نے آئینِ نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے'' (مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور، خطوط نمبر، جلدِ اول، ص ۳)۔ (یہاں محض ضمنی طور پر یہ لکھا جاتا ہے کہ ''آئین'' سے ''آئینہ'' کے املا کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جدید فارسی میں ''آیین'' ہے (فرہنگِ فارسی) ''آیینہ'' کی طرح)۔ نسخہ عرشی اور انتخابِ غالب میں ہر جگہ ''آئین'' ہی ملتا ہے۔

آئندہ: قواعد کے لحاظ سے یہ آمدن مصدر کا اسمِ فاعل ہے، مصدر: آمدن۔ مضارع: آید۔ امر:

آے، اسمِ فاعل: آیندہ (آے+ندہ = آیندہ)۔ اِس میں ی جزوِ لفظ ہے، اِس بنا پر اس میں لازماً ی لکھی جائے گی (ہمزہ نہیں لکھا جائے گا)۔ مرزا صاحب نے اِسے اِسی طرح لکھا ہے، مثلاً ''آیندہ کو حکم ہو جائے'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۴۸)۔ ''آیندہ ہر مہینے کی دوسری تیسری کو'' (ایضاً، ص ۲۵۵)۔ ''آیندہ میں راج کا متوسّل گنا جاؤں'' (مکتوب بہ نامِ مہاراجا بیکانیر۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۸۵۰)۔ ''آیندہ خانی، نوابی یا اور الفاظ'' (مکتوب بہ نامِ مولوی نعمان احمد۔ عکس: ایضاً، ص ۱۴۵۱)۔ ''آیندہ نہ ہو'' (مکتوب بہ نامِ جنونؔ بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور)۔ خطوط نمبر، جلدِ اول، ص ۱۴)۔

اجنٹ: ''صاحب اجنٹ کا نام مع اجزاے خطابی بخطِ نستعلیق لکھا جاوے'' (مکتوب بہ نامِ حکیم غلام نجف خاں۔ عکس: رسالہ آجکل (نئی دہلی) فروری ۱۹۶۵ء۔

اُدھار: ''میرے گھر میں زیورِ زرّینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں۔ ہت اودھار قرض کوئی دیتا نہیں'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۷۱)۔ اِس لفظ میں واو اعراب بالحروف کے تحت آیا ہے [مرزا صاحب نے ایسے متعدد لفظوں میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے الف کے بعد واو لکھا ہے، جیسے: اوترنا، اوس، اونھوں (وغیرہ)]۔ اب اُس واو کو (جو شاملِ تلفظ نہیں ہوتا، محض علامتِ ضمّہ کے طور پر لکھا جاتا تھا) نہیں لکھا جاتا۔ اِس بنا پر اب ''اُدھار'' لکھا جائے گا۔ ایسے سبھی لفظ اِس زائد واو کے بغیر ہی لکھے جائیں، جیسے: اُس، اُن، اُترنا، اُٹھنا (وغیرہ)۔ ہاں یہ مناسب ہوگا کہ ایسے الفاظ میں الف پر پیش لگا دیا جائے، خاص کر ''اُس، اُن، اُنھوں، اُنھیں اور اُنھی کے الف پر۔

است: تفتہ کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

''خمیدست و رسیدست میں ''زنی دست'' یہ قافیہ درست ہے، مگر ''است'' کا الف سب جگہ اُڑا دو۔ اور یاد رہے کہ صرف سین، تے کافی ہے، الف ضروری نہیں'' (خطوطِ غالب، ص ۲۴)۔ اِس عبارت کے آخری جملے سے قطعیّت کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ

یہ تاکید (است کا الف اُڑا دو) صرف اِس غزل کے قافیوں کے لحاظ سے کی گئی ہے، یا یہ بات بہ طورِ قاعدۂ املا لکھی گئی ہے کہ ایسے مواقع پر ''است'' کا الف نہیں لکھنا چاہیے۔

مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں دونوں صورتیں سامنے آتی ہیں، لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ ایسے مقامات پر، جہاں ''است'' کے لفظِ ماقبلِ منفصل کے آخر میں الف یا ہاے مختفی کے سوا کوئی اور حرف ہو، اُنھوں نے بیش تر ''است'' معِ الف لکھا ہے اور کم تر بغیرِ الف۔ آخر الذکر کی صرف دو مثالیں میرے سامنے ہیں: کارِ کلّی ہنوز در قدرست (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۶۰)۔ ''بارے خوش ست اگر ہم بدیں روش گاہ گاہ بہ نامہ یاد آورند'' [عکسِ مکتوب: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل]۔

اوّل الذکر طریقِ کتابت کی مثالیں نسبتاً زیادہ ملتی ہیں: بد است مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست [عکسِ مکتوب بہ نامِ علائی۔ غالب کے خطوط، ص ۳۸۹)۔ از کاسۂ کرام نصیب است خاک را (ص ۳۸۹)۔ آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است (ایضاً)۔ مستم ز خونِ دل کہ دو چشمم از آں پُر است (ایضاً)۔ عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است [مکتوب بہ نامِ نعیم الحق آزاد۔ عکس: ایضاً، ص ۷۲۵]۔ ''اگر گفتار است ور دانش است ارزانش است فرہنگ است'' [سندِ جانشینی بہ نامِ علائی۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۰۹)۔ ''دولتِ ابد مدّت است'' [عرضیِ مرزا غالب۔ عکس: نامہ ہاے فارسیِ غالب، ص ۱۱۶ کے مقابل]۔ ''مرقوم است'' (ایضاً)۔ ''یک حکم سرکار دولتمدار است'' (ایضاً)۔ ''لازم نفوس بشری است'' [دستاویزِ قرض۔ عکس: رسالۂ آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر، فروری ۱۹۵۲ء]۔ ''در اُردو است'' [مکتوب بہ نامِ محمد عباس رفعت [اصل خط: مخزونۂ غالب میوزیم، ایوانِ غالب، نئی دہلی]۔ ''نگرستنی است'' (ایضا)۔ ''حاصل است'' [عکسِ مکتوب: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل]۔ ''نیاز است'' (ایضاً)۔

وضاحت کے لیے اِتنی ہی مثالیں کافی ہوں گی۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر مرتّبِ کلامِ غالب کو طریقِ کار طے کرنا ہوگا۔ اِس سلسلے میں میری ذاتی راے یہ ہے کہ مختلف صورتوں میں ''است'' کا الف لکھنے یا نہ لکھنے سے متعلق جو مسلّمہ قاعدے ہیں، کلامِ غالب میں بھی اُنھی کی

مطابقت اختیار کی جائے۔ اِس سلسلے میں لغت نامۂ دہخدا کی چالیسویں جلد میں شامل مقالہ احمد بہمینار کو پیشِ نظر رکھا جاسکتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب اردو املا کے بابِ املاے فارسی میں اس سلسلے کی ضروری تفصیلات کو یک جا کردیا ہے، اُسے بھی دیکھا جاسکتا ہے [اشاعتِ ثانی ۱۹۹۸ء]۔ چوں کہ منفصل اجزا کے آخر میں مرزا صاحب نے عموماً الف لکھا ہے، اِس لیے کلامِ غالب کے لیے مرجح صورت یہی رہے گی کہ ایسے اجزا کے ساتھ "است" کا الف لکھا جائے۔

اُستاد۔ اوستاد: فارسی میں "اُستاد" اور "اوستاد" دونوں صورتیں[1] ہیں [بہارِ عجم، غیاث اللغات، فرہنگِ فارسی]۔ مرزا صاحب نے خطوں میں "اُستاد" لکھا ہے: "میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا پیر و مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں" [مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۵۱]۔ "کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا، پھر استاد کہلایا" [مکتوب بہ نامِ میر بندہ علی۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۸۰۶]۔

نظم میں دونوں طرح ملتا ہے:

بزم میں میزبانِ قیصر و جم　　رزم میں اوستادِ رستم و سام
(دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۱۳۷)

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں
(ایضاً، ص ۱۸۶)

بہ صورت، اوستادِ دلفریباں　　بمعنی، قبلۂ نا مہرباناں
(انتخابِ غالب، ص ۱۴۴)

اِس لفظ کے متعلق یہ وضاحت یوں کی گئی کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ "اوستاد" صحیح نہیں، یا یہ کہ مرزا صاحب نے واو کے اضافے کے ساتھ اشباع کے لیے لکھا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوجائے کہ مرزا

۱۔ اُستاد بہارِ عجم میں:

ما طفلِ نکتہ دانِ دبستانِ فطرتیم　　تعلیمِ اوستاد کدام و کتاب چیست (سنجر کاشی)
چوں دریں رہ اختیارِ خود با و بگذاشتم　　ہرچہ جستم، یافتم زار شادِ پیرِ اوستاد (اسیری لاہجی)

صاحب نے بیش تر ''اُستاد'' لکھا ہے۔ یعنی نظم میں ''اوستاد'' وہیں لکھا جائے جہاں وزنِ شعر کے لحاظ سے اِس طرح نظم ہوا ہو۔ نثر میں ''اُستاد'' کو ترجیح دی جائے، یوں کہ مرزا صاحب نے نثر میں اِسی طرح لکھا ہے۔

اِس سلسلے میں ایک بات ضرور توجہ طلب ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے قاطع میں کئی جگہ ''اوستاد'' لکھا ہے۔ دو تین مثالیں: ''سپس مطلعِ دیگر از اوستادِ دیگر'' [قاطع، ص ۱۵۸]۔ ''چنانکہ اوستاد گوید'' [ایضاً، ص ۱۲]۔ ''یکی از پرورش آموختگانِ قتیلِ نومسلم در کلکتہ بمن گفت: اوستاد در بارۂ کدہ وہمہ، کہ آں مرادفِ خانہ وایں ترجمۂ تمام است'' [ص ۱۵۵]۔ یہاں ''اوستاد'' کس بنیاد پر لکھا گیا ہے، میں اِس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ [اگر اشاعتِ اوّل میں اِسی طرح ہے، تو اُس سے یہ تو ثابت نہیں ہوسکتا کہ مرزا صاحب نے بھی اِسی طرح لکھا تھا]۔ میری رائے میں نثر میں (اُردو اور فارسی دونوں میں) ''اُستاد'' لکھا جانا چاہیے[1]۔

۱۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے دو خطوں کا عکس بھیجا ہے۔ اُن میں سے ایک خط تو مرزا صاحب کا ہے اُن کے قلم کا لکھا ہوا، بہ نامِ علائی، مرقومہ ''نیمروز دوشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱''۔ جو یہاں سے شروع ہوتا ہے: ''صاحب آگ برستی ہے کیونکر آگ میں گر پڑوں''۔ دوسرا خط ثاقب کا ہے علائی کے نام (دستی تحریر)۔ اِس میں دو جگہ ثاقب نے ''اوستاد'' لکھا ہے۔ چھوٹا سا خط ہے، میں پورا خط اُسی طرح نقل کیے دیتا ہوں:

''من الثاقب بجناب علائی

حضرت آجکی تاریخ میں جو عریضہ نیاز روانہ خدمت عالی ہوا ہے بعد اوسکے بند ہونے کے یہہ کتاب اوستاد صاحب نے کمترین پاس واسطے روانگی لوہارو کے بھیجی چونکہ عریضہ مصمغ ہو چکا تہا اسلئے اوسمیں کچھ اسکا حال نہ عرض کیا گیا اب یہہ کتاب لچھو سنگہ شترسوار کے ہاتھ حضور کیخدمت میں حاضر ہوتے ہی اس کی رسید جلد مرحمت ہو کہ اوستاد مکرم کو مطمئن کردے وَالتسلیم یکم اکتوبر سہ شنبہ او'' (عکس میں ''او'' کا شروع کا حصّہ ''او'' پڑھنے میں آتا ہے اور اس کے بعد کا حصّہ عکس میں نہیں آسکا ہے)۔

اِن دو جملوں میں جو ''اوستاد'' لکھا ہوا ہے، اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اعراب بالحروف کے طور پر لکھا گیا ہے۔ یعنی یہ تلفظ کا جز نہیں۔ ''اوستاد'' کا تعلق نظم سے رہا ہے۔ چوں کہ بول چال میں ''اُستاد'' آتا ہے، اِس لیے نثر میں اِسی نے جگہ پائی۔ ہاں اِس خط میں، اُس زمانے کے معمول کے مطابق الف کے بعد واو محض پیش کو ظاہر کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، جس طرح 'اوسکے' میں پیش کے لیے واو لکھا گیا ہے۔

استخر (اصطخر): مولفِ برہانِ قاطع پر مرزا صاحب نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اُس نے ''استخر'' اور ''اصطخر'' دونوں کو درجِ لغت کیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اِس لفظ کو ط کے ساتھ کیوں لکھا، یہ تو فارسی الکا لفظ ہے:

''استخر، در بحثِ الفِ مقصورہ با سینِ مسطورہ بہ معنیِ آبگیر آورد و راست گفت۔ باز..... اصطخر بہ طاے حطّی نوشت۔ همانا نفسِ مطمئنہ ندارد و نبودنِ طاے حطّی در زبانِ پہلوی دروغ مپندارد'' [قاطع، ص ۳۴]۔

''استخر'' ایران کے مشہور شہر کا نام ہے [تفصیل فرہنگِ فارسی کی پانچویں جلد میں]۔ یہاں مرزا صاحب کی یہ عبارت خاص کر یوں نقل کی گئی کہ اِس سلسلے میں اُن کے اِس نقطۂ نظر کی مزید وضاحت ہو جائے کہ فارسی الاصل لفظوں میں ت کی جگہ ط نہیں لکھنا چاہیے۔

اسٹیسن: اِس لفظ کو مرزا صاحب نے اِسی طرح (دونوں سینِ مہملہ کے ساتھ) لکھا ہے۔ ایک مکتوب بہ نامِ نواب کلب علی خاں میں یہ تین جملوں میں آیا ہے اور اِسی طرح: ''غازی آباد کے اسٹیسن پر سے سواری ہوتی تھی..... ریل کے اسٹیسن پر گئے ہیں..... بیگم باغ کے عقب میں نیا اسٹیسن قرار پایا ہے'' [عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۹۴]۔

پنسن اور اسٹیسن، اِن دونوں لفظوں کو مرزا صاحب نے اِسی طرح لکھا ہے۔ اِس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انگریزی کے یہ لفظ اُن کی زبان پر اِسی طرح تھے، یعنی اِن لفظوں کا یہ املا، تلفظ کی نمایندگی کر رہا ہے، اِس بنا پر بھی اِس املا کو بدلنا قطعی طور پر غلط ہوگا۔

ا ضمنی طور پر یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ مرزا صاحب کا یہ اعتراض درست نہیں۔ مولفِ برہانِ قاطع نے ''اصطخر'' کو ''استخر'' کی معرّب صورت بتایا ہے: ''استخر..... معرّبِ آں اصطخر است'' اور یہ بالکل صحیح ہے۔ معرّب لفظوں میں وہ سب حرف آسکتے ہیں جو عربی کے خاص حرف ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اعتراض کیا ہی تھا تو ط اور ص دونوں حرفوں کے شامل کیے جانے پر کرنا چاہیے تھا۔ ط کی طرح ص بھی عربی کا خاص حرف ہے اور ط کی طرح اُسے بھی فارسی الاصل لفظوں میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔

اسطبل: مرزا صاحب نے اِس لفظ کو س کے ساتھ لکھا ہے: ''خود، جہاں اسطبل تھا، وہاں بیٹھتے ہیں'' [عکسِ مکتوب بہ نامِ حسین مرزا، عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء]۔ اصل لفظ اِسی طرح (اسطبل) ہے۔ ''اصطبل'' اُس کی معرّب صورت ہے۔ معین نے فرہنگِ فارسی میں اِس کی وضاحت کی ہے، اِسے اصلاً لاتینی بتایا ہے اور لاتینی شکل STABULLUM لکھی ہے۔ یہی بات المنجد میں لکھی گئی ہے: الإسطبل، ج: اِسطبلات، ماوَی الدّواب (لاتینیۃ)۔ پھر آگے چل کر: ''اِصطبل اِسطبل''۔ یعنی ''اسطبل'' کو اصل لفظ کے طور پر درج کیا گیا ہے اور ''اصطبل'' کو اُس کے بدل کے طور پر۔ مرزا صاحب نے اپنے مزاج اور اندازِ فکر کے مطابق قدیم املا کو ترجیح دی ہے، اُن کے کلام میں لازماً اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ (اِس لفظ کے تلفّظ میں بھی تبدیلی ہوئی ہے، مگر وہ الگ بحث ہے، جو املا سے غیر متعلق ہے، یہاں اُس کی وضاحت کا محل نہیں)۔

افکندن۔ افگندن: مرزا صاحب نے قاطع میں لکھا ہے:

> ''افکندن، بہ فتحہ ہمزہ و فتحہ کاف عربی، مصدریست پارسی، وآنرا ''اپکندن'' نیز نویسند۔ و مبدلِ آں ''اوکندن'' است، بلکہ ''اوژندن'' نیز، چنانکہ ''شیر افکن'' را ''شیراوژن'' نیز نویسند'' (قاطع، ص ۴۴)۔

مرزا صاحب کی منقولہ عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ فارسی میں صرف ''افکندن'' (معِ کاف) ہے، مگر یہ درست نہیں۔ فارسی میں ''افکندن'' اور ''افگندن'' دونوں طرح ہے۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب اور معروف زبان شناس ڈاکٹر معین نے حاشیہ برہانِ قاطع میں اِس مصدر کو دونوں طرح لکھا ہے [جلدِ اوّل، ص ۱۵۰]۔ یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اِس کی پہلوی شکل ''افگندن'' ہے (معِ گاف) [ایضاً]۔ یہی بات اُنھوں نے اپنے معروف لغت فرہنگِ فارسی میں لکھی ہے۔ بہ ہر طور، فارسی میں یہ مصدر معِ کاف بھی ہے اور معِ گاف بھی

[افکندن۔افگندن]۔

مرزا صاحب کا قول بہت واضح ہے، اِس لیے اِس قول کی مطابقت میں اُن کے فارسی کلامِ نظم ونثر میں اِس مصدر کے جملہ مشتقات کو معِ کاف لکھا جانا چاہیے۔ ''شیر افکن'' تو خود اُنھوں نے لکھا ہے۔

عرشی صاحب نے دیوانِ غالب اُردو نسخہ عرشی اور انتخابِ غالب، دونوں میں اِس مصدر کے مشتقات کو معِ گاف لکھا ہے:

''اسد، مت کر تعجب خرد ماغیہاے منعم کا کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے''
(نسخہ عرشی، ص۷۹)

انتخابِ غالب میں ص ۱۳۲ پر ایک غزل کے چار شعر ہیں، ردیف ہے ''افگنم''، مطلع ہے:

صبحت، خیز، تانفسے درہم افگنم | از نالہ لرزہ در فلکِ اعظم افگنم

ص ۱۴۲ پر ایک غزل کے دو شعر ہیں، اُس کی ردیف بھی ''افگنم'' ہے:

نامہ برگم شد، در آتش نامہ را باز افگنم | چوں کبوتر نیست، طاؤسے بہ پرواز افگنم
ترکِ صحبت کردم و دربندِ تکمیلِ خودم | نغمہ ام جاں گشت، خواہم درتنِ ساز افگنم

مرزا صاحب کے اُس واضح قول کے بعد اصولاً اِس مصدر کے جملہ مشتقات میں کاف لکھا جانا چاہیے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے قاطع میں ہر جگہ اِس مصدر کے مشتقات کو کاف ہی سے لکھا ہے۔ صرف ایک مثال: ''اگر در آتش فکنند'' [قاطع، ص۶]۔

الا ئچی: ''پودینے کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دواخانے میں موجود رہے'' [مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۴۰]۔

الاچی اور الائچی، یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے، اِسی بنا پر اِسے اِس گوشوارے میں شامل کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب نے ''الائچی'' لکھا ہے۔

اُلجھاو: ''فلک نے مجھ پر بڑے بڑے اُلجھاو غم وفکر کے ڈالے'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: ''مرقعِ غالب، ص ۲۴۷)۔

مرزا صاحب نے ''الجھاؤ'' میں واو پر ہمزہ نہیں لکھا (یہی اِس لفظ کا صحیح املا ہے)۔ الجھانا مصدر ہے، اِس سے فعلِ مضارع 'الجھاؤ'' بنے گا اور فعلِ مستقبل ''الجھاؤ گے'' بنے گا۔ واو پر ہمزہ لازماً لکھا جائے گا۔ اور حاصل مصدر ''اُلجھاو'' بنے گا۔ الجھاو اور الجھاؤ، دو مختلف لفظ ہیں۔ ایک حاصل مصدر ہے اور ایک فعل ہے (اس سلسلے میں مزید دیکھیے: لگاو، راو)۔ اِسی ''الجھاو'' سے ''الجھاوا'' بنے گا، جس کی جمع ہے ''الجھاوے'' اور ''الجھاووں''۔ واو پر ہمزہ کہیں نہیں: اُلجھاو، اُلجھاوا، اُلجھاوے، اُلجھاووں۔

اَوَد: میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کے دو جملوں میں یہ لفظ ملتا ہے: ''اودا خبار میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی''۔ ''شاہِ اود کی املاک کی بھی واگذاشت کی خبر ہے'' (عکسِ مکتوبِ غالب، مشمولہ خطوطِ غالب ، ص ۲۸۱ کے مقابل)۔

مکتوب بہ نامِ میر محمد زکی زکی میں بھی یہ لفظ ایک جگہ آیا ہے اور مرزا صاحب نے اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا ہے: ''یہ دونوں قطعے کلیاتِ فارسی منطبعۂ مطبعِ اودا خبار لکھنؤ میں چھاپے گئے ہیں'' (عکس مشمولہ غالب کے خطوط ، ص ۸۲۱)۔

مستعمل صورت ''اودھ'' ہے، چوں کہ مرزا صاحب نے بِالتکرار اِس لفظ کو ''اَوَد'' لکھا ہے، اِس بنا پر اُن کی تحریروں میں یہی املا اختیار کیا جائے گا۔ ہاں مہیش پرشاد نے ''اود'' ہی لکھا ہے (خطوطِ غالب ، ص ۲۸۱) اور صحیح طور پر۔

اوفتادن، اُفتادن، فتادن: مرزا صاحب نے پنج آہنگ میں لکھا ہے:

> ''اوفتادن، اوفتاد، اوفتادہ، اوفتد، اوفت۔ فاعلِ ایں مسموع نیست۔ ہمانا وجہش ایں باشد کہ ''اوفتادن'' فعلِ اضطراریست، نہ اختیاری۔ دیگر باید دانست کہ ایں بحث بہ حذفِ واو نیز آید، یعنی: افتادن، بلکہ بہ حذفِ الف نیز رواست، یعنی: فتادن'' (ص ۱۰۵)۔

مرزا صاحب کی نگارش کے مطابق اِس مصدر کی مستعمل صورتیں تین ہیں: اوفتادن، افتادن، فتادن؛ یہ بات بجائے خود درست ہے۔ شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ ''اوفتادن'' (مع واو) اور ''فتادن'' فارسی سے متعلق ہیں اور یہ کہ اُردو میں ''افتادن'' مستعمل ہے؛ اِس لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ مرزا صاحب نے اُردو میں اِن تینوں مصدروں کے مشتقات کو نظم کیا ہے۔ اوفتادن اور فتادن کے مشتقات کی مثالیں:

دور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مرغِ خیالِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج
(نسخۂ عرشی، ص ۳۵)

تنِ بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں
دلِ زکارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں
(نسخۂ عرشی، ص ۵۹)

بر خاک اوفتادگیِ کشتگانِ عشق
ہے سجدۂ سپاسِ بہ منزل رسیدگی
(نسخۂ عرشی، طبعِ ثانی، ص ۴۵۴)

خوش اوفتادگی کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کروں
(نسخۂ عرشی، طبعِ اوّل، ص ۴۵۴)

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
بہ رنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
(نسخۂ عرشی، طبعِ اوّل، ص ۶۳)

مکتوب بہ نامِ علائی میں مرزا صاحب نے اپنی جو غزلیں (اپنے قلم سے) لکھی ہیں، اُن میں سے ایک غزل کے اِس شعر میں ''افتاد'' آیا ہے۔ چوں کہ اُن کے قلم کی یہ واحد مثال ہے ہمارے سامنے افتادن سے مشتق کسی لفظ کے استعمال کی، اِس لیے یہاں اُس کی نشان دہی کی جاتی ہے:

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

[عکسِ مکتوب بہ نامِ علائی مشمولۂ غالب کے خطوط، ص ۳۸۹]۔ نظم میں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ شعر میں ''اوفتادن'' ہے یا ''اُفتادن''، نثر میں اِس طرح تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی

اور سند موجود نہ ہو، تو پھر مناسب یہ ہوگا کہ نثر میں "افتادن" کے مشتقات کو مرجح قرار دیا جائے۔

بادشاہ۔ پادشاہ: مرزا صاحب نے تیغ تیز میں لکھا ہے:

"غالب کہتا ہے "پاد" بزاے پرانا لغت بہ معنی بزرگ کے ہے، اور اِسی سے مرکب ہے "پادشاہ"، یعنی سلطانِ اعظم۔ بادشاہ بہ موحدہ غلط ہے۔ چوں کہ ہندستان میں "پاد" گوز کو کہتے ہیں، اِس لیے بائے فارسی کی جگہ موحدہ لگا دی ہے" [قاطع، ص ۲۸۱]۔

فارسی میں "پادشاہ" ہے (برہانِ قاطع، فرہنگِ فارسی)۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے:

"پادشاہ بہ باے فارسی صحیح است، نہ بہ باے عربی۔ واین کہ در ہندستان بہ باے عربی شہرت دارد، ظاہرا از جہتِ استکراہ جزوِ اوّل است از کلمۂ مذکور، کہ بہ زبانِ ہندی قبیح است۔ و لفظِ پادشاہ مرکب است از "پاد" و "شاہ"۔

مرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب وہی ہے جو مولفِ غیاث لکھ چکے تھے۔ بہ ظاہر مرزا صاحب نے اُنھی کی فارسی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اِس سے قطعِ نظر، مرزا صاحب نے یہ جو لکھا ہے: "بادشاہ غلط ہے" اِس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ انھوں نے "بادشاہ" کو مطلقاً غلط کہا ہے۔ مرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ فارسی نظم و نثر میں [اور اِس میں مرزا صاحب کا فارسی کلام بھی شامل ہے] لازماً "پادشاہ" لکھنا چاہیے۔ ہاں ہندستان والوں کی زبان (اُردو) میں "بادشاہ" لکھ سکتے ہیں۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ اُردو میں مرزا صاحب نے اپنے قلم سے "بادشاہ" اور "بادشاہی" لکھا ہے، کہیں "پادشاہ" نہیں لکھا۔ چند مثالوں سے اِس کی توثیق بہ خوبی کی جا سکتی ہے: "شادی بادشاہ کے فرزندِ ارجمند کی" (مکتوب بہ نامِ عبدالحق، عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۷۷)۔ "اود اخبار میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی" (مکتوب بہ نامِ مجروح۔ عکس: خطوطِ غالب، ص ۲۸۱ کے مقابل)۔ "یہ بھی بادشاہی تنخواہ ہوئی (ایضاً)۔ "بادشاہ کا نوکر ہوا (خود نوشت حالات۔ عکس: مرقعِ غالب)۔

اِس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مرزا صاحب کے فارسی کلامِ نظم ونثر میں ''پادشاہ'' لکھا جانا چاہیے۔ اُردو میں چوں کہ خود اُنھوں نے ''بادشاہ'' اور ''بادشاہی'' لکھا ہے اور ''پادشاہ'' نہیں لکھا، اِس بنا پر اُردو نظم ونثر میں ''بادشاہ'' اور ''بادشاہی'' لکھنا چاہیے (جس طرح اُردو میں لکھا جاتا ہے)۔

بارنٹ: ''فرزندار جمند بجاں پیوند سلطانی بارنٹ تامس سافلس منکف صاحب بہادر'' (عکس: عبارتِ پیشانیِ قطعۂ مدحیہ: آج کل (نئی دہلی)، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۵ء)۔

بایستن: ''بایستن، بایست، باید، بایستہ'' (پنج آہنگ)۔ بایست (بہ قدرِ بایست) اور باید، مستعمل لفظ ہیں، اِن میں ہمزہ کہیں نہیں لکھا جائے گا۔ (''باید'' کی طرح ''شاید'' میں بھی ہمزہ نہیں آتا)۔

برگڈیر: ''جرنیل صاحب نے چارسو سوار کا برگڈیر کیا'' (خود نوشت حالات۔ عکس: مرقعِ غالب)۔

بُلعجبی، بُلہوس: ''جامعِ کشف اللغات کہ در بلعجبی از صاحبِ برہان پایہ کمی ندارد'' (قاطعِ برہان ورسائلِ متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۱۶۷)۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

(نسخۂ عرشی، ص ۲۳۳)

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں

(ایضاً، ص ۱۹۳)

تا چند بُلہوس ے و عاشق ستم کشد — گو فتنہ، تا بد اوری ہم علم کشد

(انتخابِ غالب، مرتبہ عرشی صاحب، ص ۹۰)

مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں، جن کے عکس پیشِ نظر ہیں، یہ دونوں لفظ نہیں ملے۔ قاضی صاحب اور عرشی صاحب، دونوں نے یہ وضاحت نہیں کہ اِن لفظوں کا یہ املا کس

بنیاد پر اختیار کیا گیا ہے اور یہ کہ نسخۂ عرشی میں اور انتخابِ غالب میں ''بلہوس'' اور ''بوالہوس'' دو طرح کیوں لکھا گیا ہے اور یہ بھی کہ اِن میں سے صحیح یا مرجّح صورت کون سی ہے۔

فرہنگِ جہانگیری اور برہانِ قاطع میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ ''بلہوس'' میں جو سابقہ ہے، وہ فارسی کلمہ ''بُل'' ہے، جو کثرت کے معنی دیتا ہے (یعنی یہ عربی کے ''ابو'' کا مخفف ''بو'' نہیں، جسے عربی ترکیب کے مطابق لکھا جائے):

> ''بُل: با اوّلِ مضموم بثانیِ زدہ، دو معنی دارد: اوّل، احمق... دوم، بہ معنیِ بسیار آمدہ، چنانچہ: بلہوس و بلکامہ، بمعنیِ بسیار ہوس و بسیار کام بود'' (فرہنگِ جہانگیری)۔ ''بُل بہ ضمِ اوّل، بمعنیِ بسیار باشد، ہمچو بلہوس، بلکامہ۔ یعنی بسیار ہوس و بسیار کام'' (برہانِ قاطع)۔

احمد بہمیار نے لغت نامہ دہخدا کی چالیسویں جلد میں ''املای فارسی'' کے عنوان کے تحت ''بُلہوس'' کی صحت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ قابلِ توجہ ہے:

> ''یکی از تصرّفِ فارسیان در کلماتِ عربی این است کہ ہمزۂ ''ابو'' را از ابتدای کنیۂ عربی حذف میکنند و ابوالحسن و ابوسعید را فی المثل بوالحسن و بوسعید میگویند و مینویسند۔ و از ینجا جمعی از کلماتِ ''بلہوس و بلعجب و بلفضول'' باشتباہ اُفتادند و آنہارا مخففِ ''ابوالہوس و ابوالعجب و ابوالفضول'' پنداشتہ اند و در کتابت ''بوالہوس و بوالعجب و بوالفضول'' مینویسند۔ غافل ازینکہ عرب ''ابوالہوس و ابوالعجب و ابوالفضول'' نگفتہ است۔ و اگر ترکیبِ ایں سہ کلمہ عربی میبود، در اثرِ نویسندگانِ دانشمندِ فارسی بصورتِ غیر مخفف ہم دیدہ میشد، چنانکہ بوالحسن، و ابوالحسن، و بوسعید و ابوسعید ہر دو دیدہ میشود۔
>
> و بہر حال، جزوِ اوّلِ ایں کلمات کہ ''بُل'' باشد، فارسی و

ادات تکثیر، وظیرِ "بُل" در کلماتِ "بُلکامہ" (بسیار کام پُر مدعا) و "بُلغاک" (غوغا و آشوبِ بسیار) و "بُلغندہ" (بالای ہم نہادہ، جمع کردہ، فراہم آوردہ) است۔ و باید بدونِ واو و الفِ زاید، و چسبیدہ بکلمہ نوشتہ شود" (لغت نامہ دہخدا، شمارۂ چہلم)۔

مقالہ نگار اور لغت نویسوں کی صراحت کے مطابق "بُل" کلمہ فارسی ہے جو کثرت کے معنی دیتا ہے اور بلفضول، بلعجب، بلہوس میں یہی "بُل" ہے۔ عربی کے "بو" سے اس کا کچھ تعلق نہیں، اس بنا پر بوالہوس، بوالعجب (وغیرہ) نہیں لکھنا چاہیے۔

اِس صراحت کی روشنی میں قاضی صاحب اور عرشی صاحب نے "بلہوس" اور "بلعجبی" صحیح طور پر لکھا ہے اور اِس بنا پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلامِ غالب میں اِن لفظوں کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔

[ایک ضمنی حوالہ۔ نور اللغات میں (جو اردو کا لغت ہے) "بوالہوس" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس سے اختلاف کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میں خود "بلہوس" لکھتا ہوں: "یعنی قاموس الاغلاط کے مصنفین کا ہم نوا ہوں۔ میں نے اکثر قلمی کتابوں میں املا "بلہوس" بجائے بوالہوس لکھا دیکھا ہے" (فرہنگِ اثر، ص ۲۰۴]۔

بناو۔ بناؤ: دیکھیے لگاو۔

بوڑھا، بوڈھا، بُڑھیا: عرشی صاحب نے حواشیِ مکاتیبِ غالب میں مکتوب بہ نام نواب کلبِ علی خاں، مرقومہ ۱۸ر جون ۱۸۶۵ء کے ایک جملے پر حاشیہ لکھا ہے۔ مرزا صاحب کا جملہ یہ ہے: "سفر خصوصاً بوڑھے رنجور کو دونوں صورتوں میں متعذر"۔ اِس پر عرشی صاحب نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

> "اصل: بوڈھے، مگر اس لفظ کو جون ۶۶ء کے عریضے کے ساتھ والی غزل میں "بوڑھا" ڑے کے ساتھ لکھا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ آخر میں میرزا صاحب نے تلفظ اور

املا، دونوں بدل دیے تھے'' (ص ۱۵۱)۔

عرشی صاحب کے الفاظ'' آخر میں میرزا صاحب نے تلفظ اور املا، دونوں بدل دیے تھے'' سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب ۱۸ر جون ۱۸۶۵ء کے محولہ بالا خط کے زمانۂ تحریر تک ''بوڈھا'' لکھا کرتے تھے۔ جون ۱۸۶۵ء سے اُنھوں نے ''بوڑھا'' لکھنا شروع کیا، مگر یہ بات درست نہیں۔ منقولہ بالا جملے میں بے شک ''بوڈہا'' (ڈال کے ساتھ) لکھا ہوا ہے۔ مرقعِ غالب میں اِس خط کا عکس شامل ہے، جو پیشِ نظر ہے، مگر اِس سے پہلے کی (اور اِس کے بعد کی) جو تحریریں مرزا صاحب کی عکسی صورت میں میرے سامنے ہیں، اُن میں ''بوڈھا'' (ڈال کے ساتھ) کسی ایک جگہ نہیں ملتا۔ ہر جگہ بوڑھا، بوڑھے اور بُڑھاپے ملتا ہے، اِسی طرح بڑھیا:

''بُڑھاپے نے'': مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم، اکتوبر ۱۸۵۹ء۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب۔

''بُڑھاپے میں'': مکتوب بہ نامِ محمود مرزا۔ عکس مشمولہ ''غالب کے خطوط'' ص ۳۵۷۔

''بُڑھیا'': مکتوب بہ نامِ محمود مرزا۔ عکس مشمولہ ''غالب کے خطوط'' ص ۳۵۷۔

''تندرست ہوں مگر بوڑھا ہوں'': مکتوب بہ نامِ جنوں بریلوی، جنوری ۱۸۶۴ء۔ ایضاً، ص ۱۵۰۵۔

''میں بوڑھا اور ناتواں'': مکتوب بہ نامِ جنوں بریلوی، جون ۱۸۶۴ء۔ [عکس: نقوش (لاہور)۔ خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۷]۔

''بہ شمول بڑھاپے کے'': مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ جون ۱۸۶۶ء [عکس مشمولہ مرقعِ غالب]۔

بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں اسد
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

مندرجہ مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ ۱۸۶۶ء۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۷۶۔

''میرے بُڑھاپے اور میری مفلسی کی'': اگست ۱۸۶۷ء۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب۔

''بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے'': ایضاً۔ ستمبر ۱۸۶۷ء۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب۔

''اِس بوڑھے اپاہج فقیر کو'': ایضاً۔ دسمبر ۱۸۶۷ء۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب۔

۱۸؍جون ۱۸۶۵ء کے خط میں جو ''بوڈھا'' ہے، اُسے یا تو سہوِ قلم ماننا چاہیے، یا پھر یہ مان لینا چاہیے کہ یہ ایک مثال، املا کے تعیّن میں بہت سی مختلف مثالوں کے سامنے متروک کے ذیل میں آئے گی اور اُس کو املائی حساب میں نہیں رکھا جائے گا۔ اگر مرزا صاحب واقعتاً ''بوڈھا'' تلفظ کرتے ہوتے اور لکھتے ہوتے، تو کہیں اور بھی تو اِس طرح لکھتے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب کے کلام میں ہر جگہ بوڑھا، بوڑھے، بُرھاپے اور بُرھیا مرجّح املا ہوگا۔

بناو، بناوٗ: دیکھیے ''لگاوٗ''۔

بونٹی: نواب کلبِ علی خاں کے نام خط میں مرزا صاحب نے اپنے خلعت سات پارچے کی تفصیل لکھی ہے، اُس میں ''بنارسی تھان سنہری بونٹی'' لکھا ہے [مکتوبہ ۱۸؍دسمبر ۱۸۶۶ء۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب]۔ اب عموماً ''بوٹی'' لکھتے ہیں، مگر اِس کا املا مع نونِ غنّہ بھی تھا۔ فرہنگِ آصفیہ میں ''بوٹا یا بونٹا'' اور ''بوٹی یا بونٹی'' ہے۔ ''بونٹے'' باغ و بہار میں ہے اور ''بونٹی'' سحر البیان میں آیا ہے۔ اِس بنا پر مرزا صاحب کی تحریر میں اس لفظ کو اِسی طرح (بونٹی، مع نونِ غنّہ) لکھنا چاہیے۔ دہلی میں انفیت کا رجحان بہت کارفرما رہا ہے، مثلاً مرزا صاحب نے ''چانول'' کو مستعملِ فصحا بتایا ہے [اِس کا حوالہ آگے آئے گا]۔ یہ لفظ بھی اُسی رجحان کی آئینہ داری کرتا ہے۔

بھروسا: قاضی عبدالجمیل جنوؔن بریلوی کے نام خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''پس جب اُس کو اپنے پر ایسا بھروسا ہے'' [عکس مشمولہ مرقعِ غالب، ص ۲۹۰]۔ غیر فارسی عربی لفظوں کے آخر میں الف اور ہائے مختفی کی بحث آگے چل کر اِسی عنوان کے تحت آئے گی اور وہاں ایسے لفظوں کی یک جائی نشان دہی کی جائے گی۔ مرزا صاحب کی تحریر کے کسی بھی عکس میں، جو پیشِ نظر ہیں ''بھروسہ'' نہیں ملتا، لہٰذا اِس لفظ کے متعلق پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِسے ''بھروسا'' لکھنا چاہیے۔ (صحیح املا بھی یہی ہے)۔

بہنگی: نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''نوازش نامہ اور اُس کے ساتھ دو بہنگیاں دوسو آموں کی پہنچیں'' (عکس مشمولہ مرقعِ غالب، ص ۲۲۷)۔ اِس لفظ کے املا کی وضاحت یوں کی گئی کہ اس کا املا بنہگیاں'' (نونِ غنہ، ہ سے پہلے۔ جیسے ''منہ'' میں نونِ غنہ، ہ سے پہلے ہے) بھی بتایا گیا ہے (اردو املا، ص ۱۸۵)۔ چوں کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''بہنگیاں'' لکھا ہے، اِس لیے اُن کی تحریر میں اِسی املا کو اختیار کیا جائے گا۔

بھوکا: ''بھوکا پیاسا، کمبل اوڑھ کر پڑ رہا'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۰۰)۔ اِس لفظ کو اِس گوشوارے میں محض احتیاطاً شامل کیا گیا ہے، اِس وجہ سے کہ ''بھوکھ'' اور ''بھوکھا'' (دو ہائے مخلوط کے ساتھ) بھی ایک زمانے میں لکھے جاتے تھے۔ بعض پرانی تحریروں میں یہ لفظ اِس طرح مل جاتے ہیں۔ مرزا صاحب نے ''بھوکا'' دوسری ہائے مخلوط کے بغیر لکھا ہے۔ آج کل بھی اِسی طرح لکھا جاتا ہے، اِسی طرح بھوک۔

مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے لکھا ہے:

> ''بھوکا کا تلفظ کچھ اِس طرح کیا جاتا ہے کہ واو کے بعد نونِ غنہ محسوس ہوتا ہے۔ بیتاب کے کاتبِ مسوّدۂ دیوان نے ''بھونکا'' لکھ دیا تھا۔ میرزا صاحب نے اُسے نونِ غنہ سے پاک کر کے ''بھوکا'' بنا دیا ہے'' (ص ۲۲۹)۔

پانو: مرزا صاحب نے کئی بار اِس کی وضاحت کی ہے کہ صحیح املا ''پانو'' ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ''پاؤں'' غلط املا ہے، اِس طرح نہیں لکھنا چاہیے۔ قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی کے نام خط میں، اُن کے ایک شعر کی اصلاح کے تحت لکھا ہے:

> ''ننگے پاؤں، واو کے ضمّے کو اشباع کیسا، یہ تو ترجمہ ''پابرہنہ'' کا ہے۔ اور پھر ''پاؤں'' کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو'' (عکس مشمولہ خطوطِ غالب، ص ۱۱۸ کے مقابل)۔

''یافتن'' فارسی کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں: پانا۔ اِس کے فعلِ مضارع کا صیغۂ واحد متکلم ہے ''یابم''، جس کے معنی ہیں: میں پاؤں۔ مرزا صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ''پاؤں'' تو ''یابم'' کا ترجمہ ہوا، یعنی یہ فعل ہوا، جب کہ ''پانو'' فعل نہیں، اسم ہے۔ ''پانو'' کو اگر ''پاؤں'' لکھا جائے گا، تو اُس کے معنی بدل جائیں گے، پیر کے بجائے اُس کے معنی ہوں گے: میں پاؤں۔ (جیسے لانا سے لاؤں، کھانا سے کھاؤں، جانا سے جاؤں، اُسی طرح پانا سے پاؤں)۔

ایک اور شاگرد کو لکھا ہے:

> ''پانو، قافیہ گانو اور چھانو کا ہے۔ آگے اُس کے نون لکھنا غلط ہے، مگر ہاں بہ صیغۂ جمع یوں لکھنا چاہیے: پانوؤں'' (خطوطِ غالب، مقدمہ، ص ح)۔

بیتاب رام پوری کا مصرع تھا: ''ہے گریباں ہاتھ میں اور پانو میں زنجیر ہے''۔ مرزا صاحب نے اصلاح دیتے ہوئے 'میں' سے پہلے ن کو قلم زد کر دیا (مکاتیبِ غالب، ص ۹۵)۔

قاطع میں لکھا ہے:

> ''پاے را در ہند 'پانو' گویند کہ با 'گانو' قافیہ تواند شد'' (ص ۵۴)۔

مرزا صاحب کی خطّی تحریروں میں ہر جگہ ''پانو'' ملتا ہے، مثلاً: ''ایک پانو زمین پر'' (مکتوب بہ نامِ جنوں بریلوی۔ عکس مشمولہ غالب کے خطوط، ص ۳۴۷)۔ ''ایک پانو رکاب میں'' (مکتوب بہ نامِ حکیم محب علی۔ عکس ایضاً، ص ۴۰۷)۔ مرزا صاحب کی ایک غزل کی ردیف ''پانو'' ہے اور وہ اُن کے دیوان میں حرفِ واو کی ردیف میں ہے۔ اُس کا مطلع ہے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو[1]

رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو

۱۔ یہ پُر معنی شعر اِسی غزل کا ہے:

بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ — ہو کر اسیر، دابتے ہیں راہ زن کے پانو

مرزا صاحب نے صرف یہ نہیں لکھا کہ صحیح املا "پانو" ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ "پاؤں" غلط املا ہے؛ اِس بنا پر اُن کے کلامِ نظم ونثر میں لازماً "پانو" لکھا جائے گا اور "پاؤں" کو قطعی طور پر ناقابلِ قبول مانا جائے گا۔

پتا: مرزا صاحب کی تحریروں میں، یعنی اُن کے قلم سے لکھی ہوئی تحریروں میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے، مثلاً: "سیّد فرزند احمد کے مکان کا پتا" (مکتوب بہ نامِ عبدالغفور سرور۔ عکس مشمولہ غالب کے خطوط، ص ۶۱۷)۔ "تمھارے مکان کا پتا" (مکتوب بہ نامِ حسین مرزا۔ عکس: علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء)" ایسے ڈوبے کہ اُن کا پتا نہیں ملتا" (مکتوب بہ نامِ مولانا عباس رفعت۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۳۷)۔ "اپنے مسکن کا پتا لکھ دیا" (ایضاً)۔ "طراوت ورطوبت کا کہیں پتا نہیں" (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس ایضاً، ص ۱۲۸۱)۔ "جو پتا اِن حضرت کے مکان کا ہو، خط پر لکھ دیں" (مقالہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی: غالب کے خطوں کے لفافے۔ عکس لفافے کا۔ مشمولہ رسالہ ہندستانی، الٰہ آباد۔ اپریل ۱۹۳۴ء، ص ۱۴۰ کے مقابل)۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی نظم ونثر میں اِس لفظ کا یہی املا اختیار کیا جائے گا۔ (اِس لفظ کا صحیح املا بھی یہی ہے۔ مرزا صاحب کی نظم ونثر میں "پتہ" نہیں لکھا جائے گا، جس کی اصل حیثیت غلط العوام کی سی ہے)۔ نسخۂ عرشی میں صحیح طور پر "پتا" ملتا ہے، صرف دو مثالیں:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

(نسخۂ عرشی، ص ۱۹۱)

تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلادوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟

(نسخۂ عرشی، ص ۱۵۸)

پچھتانا: صاحب زادہ عباس علی خاں بیتاب رام پوری کی غزل کے ایک شعر کا دوسرا مصرع تھا:

کر کے شکوہ بھی اُن سے پچھتائے۔ مرزا صاحب نے ''پچھتائے'' کو قلم زد کرکے، اُس کی جگہ ''پچتائے'' لکھ دیا (عرشی صاحب: مکاتیبِ غالب، ص ۹۸)۔ اِس اصلاح سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اِس مصدر کے مشتقات کو ھ کے بغیر صحیح سمجھتے تھے [یعنی پچتانا، پچتایا، پچتائے (وغیرہ)]۔ ظاہر ہے کہ کلامِ غالب میں اِس مصدر کے مشتقات کا یہی املا اختیار کیا جانا چاہیے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فرہنگِ آصفیہ میں صرف ''پچتانا'' ہے اور ''پچتاوا''۔ پچھتانا'' اِس لغت میں موجود نہیں۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ دہلی میں بہ طورِ عموم ''پچتانا'' اور اِس کے مشتقات ھ کے اضافے کے بغیر مستعمل تھے۔ اور یہ بھی کہ جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں بھی صرف ''پچتانا'' درج کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ، دونوں جگہ یہ ھ کے بغیر مستعمل رہا ہے۔

پردہ: فارسی عربی کے وہ لفظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہے، اُن میں سے بعض کو مرزا صاحب نے دو طرح لکھا ہے: آخر میں الف، آخر میں ہائے مختفی۔ مثلاً ''روانہ'' کہ اِس کو ''روانا'' بھی لکھا ہے (دیکھیے: روانہ)۔ مرزا صاحب کی جو دستی تحریریں پیشِ نظر ہیں، اُن میں ''پردہ'' (یا پردا) مجھے نہیں ملا۔ اِس بنا پر یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ (ایسے اور لفظوں کی طرح) اِس لفظ کو بھی اُنھوں نے ایک ہی طرح (یعنی اصل کے مطابق) ''پردہ'' لکھا ہوگا۔

اِس لفظ کو محض احتیاطاً اِس گوشوارے میں شامل کیا گیا ہے اور اِس احتیاط کی اصل وجہ ہے نسخۂ لاہور کے یہ شعر:

در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی　　ظاہر کا یہ پردا ہے کہ پردا نہیں کرتے

(ص ۹۰)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یہاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

(ص ۸)

[''یہاں'' نسخۂ لاہور کے مطابق ہے۔ مرزا صاحب بھی اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا کرتے تھے۔ دیکھیے: ''یہاں، وہاں'']۔ پہلے شعر میں ''پردا'' دو جگہ آیا ہے (''درپردہ''

سے قطعِ نظر) ایک جگہ تو وہ ایسے لفظوں کا ہم قافیہ ہے جن کے آخر میں الف ہے، اِس بنا پر وہاں تو ہر حال میں ''پردا'' لکھا جائے گا، مگر ''ظاہر کا یہ پردا'' میں ''پردا'' صحیح نہیں، یہاں ''پردہ'' ہونا چاہیے تھا، یوں کہ ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے کہیں ''پردا'' لکھا ہو۔ نسخہ عرشی میں (قافیے کی ضرورت سے قطعِ نظر) ہر جگہ ''پردہ'' ملتا ہے اور صحیح طور پر، مثلاً:

مُنہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ، زرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے

(ص ۲۳۵)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

(ص ۱۵۵)

کہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے (۲۴۶)

درپردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

(ص ۲۳۵)

پنسن: مرزا صاحب نے اِس لفظ کو ہر جگہ اِسی طرح (مع سینِ مہملہ) لکھا ہے۔ محض بہ طورِ مثال دو خطوں کے حوالے درج کیے جاتے ہیں۔ مکتوب بہ نامِ مولانا نعیم الحق آزاد میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے:

''پنسن داروں کا اجراے پنسن''۔ ''خاص میرے پنسن کے باب میں'' (عکس مشمولہ غالب کے خطوط، ص ۸۲۵)۔

''عطاے پنسنِ قدیم کا حکّام کو خیال بھی نہیں''۔ ''شروع سال میں پنسن داروں کو روپیہ ملے گا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۱۴)۔

''اسٹیسن'' اور ''پنسن'' اِن دونوں لفظوں کو مرزا صاحب نے اِسی طرح، یعنی مع سینِ

مہملہ لکھا ہے (اور یہ کہ "پنسن" کو مذکر لکھا ہے۔ اب عموماً مونث بولتے ہیں)۔

پوچھنا: بیتاب رام پوری کی غزل کا مصرع تھا: "خدا کے آگے ہمیں پونچھے جائیں گے پہلے"۔ مرزا صاحب نے اصلاح کے تحت لکھا: "پونچھنا اور ہے۔ پُرسیدن کا ترجمہ بے نون ہے" (مکاتیبِ غالب، ص۱۰۰)۔

عرشی صاحب نے مزید لکھا ہے: "پوچھنا کو بیتاب اور ناظم کے کاتبوں نے "پونچھنا" لکھا تھا، مرزا صاحب نے اِس غلطی کی بالالتزام اصلاح کی ہے" (ایضاً، ص۲۲۹)۔ مرزا صاحب کی تحریروں کے جو عکس پیشِ نظر ہیں، اُن میں "پرسیدن" کا مرادف "پونچھنا" (مع نون) کہیں نہیں ملتا۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ مرزا صاحب نے بعض لفظوں کو نونِ غنہ کے اضافے کے ساتھ صحیح مانا ہے (جیسے: سونچنا، چانول) یہ قیاس نہ کرلیا جائے کہ وہ "سونچنا" کی طرح، اِسے بھی "پونچھنا" لکھتے ہوں گے۔ یہ بات نظر میں رکھنے کی ہے کہ کسی نہ کسی سطح پر اس مصدر کے مشتقات کو مع نونِ غنہ لکھا جاتا تھا۔ مثلاً خورشید لکھنوی کی کتاب افادات کا پہلا اڈیشن میرے سامنے ہے (مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ۔ سالِ طبع ۱۸۹۰ء) اِس کتاب میں جگہ جگہ اس مصدر کے مشتقات مع نونِ غنہ ملتے ہیں (ظاہر ہے کہ اِس کا تعلق کتابت سے ہے)۔ ہاں لغات میں بہ طورِ عموم یہ مصدر نونِ غنہ کے بغیر ہی ملتا ہے۔

پہنچنا: اِس مصدر کے مشتقات کو اب بھی کچھ لوگ مع واو [پہونچنا، پہونچا، پہونچے گا (وغیرہ) لکھتے ہیں اور اب سے پہلے تو بہت سے لوگ اِس طرح لکھا کرتے تھے اور یہ عام بات تھی۔ مرزا صاحب نے اپنی تحریروں میں ہر جگہ اِس مصدر کو اور اِس کے مشتقات کو واو کے بغیر لکھا ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا: "پہنچنا، پہنچتا، پہنچا" [عکسِ مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں، مرقعِ غالب، ص۱۰۰]۔ "پہنچا، پہنچتا تھا، پہنچا کرے" [عکسِ مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم، مرقعِ غالب، خط۲]۔ مزید مثالوں کی ضرورت یوں نہیں کہ مرزا صاحب نے اِس مصدر کو اور اِس کے مشتقات کو اِسی طرح لکھا ہے۔

اِس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے۔ مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم میں ایک مرکّب جملہ یوں ہے: ''خط اُس دار و گیر میں گر پڑا، بھیگ گیا، لفافہ مجھ تک نہ پہنچا'' [عکس مشمولہ مرقعِ غالب، خط ۱۶]۔ اِس میں ''نپونچھا'' لکھا ہوا ہے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ یہاں لغزشِ قلم کے نتیجے میں ''نہ پہنچا''، ''نپونچھا'' بن گیا۔ مرزا صاحب کی مختلف تحریروں میں سہوِ قلم کی متعدّد مثالیں ملتی ہیں، اِسے بھی اُنھی مثالوں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ عرشی صاحب کی بھی یہی رائے ہے: ''یہ سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے'' [مکاتیبِ غالب، حواشی ص ۱۲۲]۔

اِس سہوِ قلم کو ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے [جن کی تصحیح کے ساتھ خطوطِ غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد چھپی تھی] سہوِ قلم کے بجائے سوچا سمجھا طرزِ نگارش مانا ہے۔ اِسے ''قلبِ مع اِبدال'' کے تحت رکھا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے: ''ھ اور ہ کے قلب مع اِبدال کی مثالیں.... ''پہنچا'' کی جگہ ''پونچھا'' [مقدمہ خطوطِ غالب، ص ی]۔ میری تو یہ مجال نہیں کہ اِس ''قاعدے'' اور اُس کی اِس مثال پر رائے ظاہر کرسکوں۔ [صدّیقی صاحب ہم میں سے بہتوں کے معنوی اُستاد تھے] بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُستادِ معظم نے اِس لغزشِ قلم کی جو تعبیر کی ہے، وہ قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی۔

پَے: فارسی کا یہ لفظ متعدّد معنوں میں فارسی و اُردو میں مستعمل رہا ہے۔ مثلاً مرزا صاحب کے اِس جملے میں یہ ''پیچھے'' کے معنی میں آیا ہے: ''روحِ تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی'' (مکتوب بہ نامِ ناظم، عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۲۹)۔ اُردو میں زیادہ تر واسطے، لیے کے معنوں میں مستعمل ہے اور پَیر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ''دَرپَے'' اِسی سے بنا ہے۔ ''پے'' میں پ پر زبر ہے؛ یہ مَے، نَے، شَے جیسے لفظوں کا ہم قافیہ ہوسکتا ہے۔ اِس طرح یہ قطعی طور پر واضح ہے کہ اِس کے آخر میں ے ہے۔ اِسے اگر ''پی'' لکھا جائے گا، تو اُردو میں یہ ''پیا'' (بہ معنیِ محبوب) کا مخفف ہوگا، یا پھر ''پینا'' مصدر کا فعل، جیسے: چاے پی، شراب پی۔

یہ ساری وضاحت یوں کی گئی کہ نسخہ عرشی میں اِس لفظ کا املا اکثر جگہ محلِ نظر ہے۔ اِسے اضافت کی صورت میں کہیں ''پی'' لکھا گیا ہے اور کہیں ''پے'' اور یہ املائی دو رنگی اِس نسخے میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ مختلف معانی کی نسبت سے میں ایسے بس چند اشعار نقل کرتا ہوں، اثباتِ

مدّ عا کے لیے یہی کافی ہوں گے:

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل　　سیلابِ گریہ درپَئے دیوار و در ہے آج

(نسخۂ عرشی، ص ۱۶۵)

ضعف سے نقشِ پَئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

(ایضاً ص ۱۹۵)

پَئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بہ خوں غلتیدۂ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا

(ایضاً ص ۱۴۶)

تپشِ دلِ شکستہ، پئے عبرت آگہی ہے
کہ نہ دے عنانِ فرصت بہ کشاکشِ زبانی

(ایضاً ص ۹)

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

(ایضاً ص ۱۰)

نعل سی کی ہے پئے زمزمہ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

(ایضاً ص ۱۳۲)

پَئی اور پے، اِس ایک لفظ کے یہ دو املا ملتے ہیں اور یہ غیر ضروری اور غیر حقیقی اختلافِ صورت نگاری قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اِس لفظ کا صرف ایک املا ''پے'' قابلِ قبول ہے۔

اِس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ نسخۂ عرشی میں ص ۲۲۸ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے

اِس غزل میں لَے ، نَے ، مَے ، شَے ، ہے، دَے [اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے] قَے ، اَے بہ طورِ قافیہ آئے ہیں۔ اِن سب لفظوں کو اِسی طرح (مع ے) لکھا گیا ہے اور پہلے حرف پر التزام کے ساتھ زبر لگایا گیا ہے۔ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ یہ دو حرفی لفظ، جن کے پہلے حرف پر زبر ہے، بہ یاے مجہول لکھے جائیں گے، اور یہ بالکل درست ہے۔ اِن لفظوں کا صحیح املا یہی ہے۔ ''پے'' بھی اِسی قبیل کا لفظ ہے۔ یہ بھی دو حرفی ہے اور اِس کے بھی پہلے حرف پر زبر ہے، یوں اِسے بھی نَے، شَے، ہے کی طرح ''پے'' لکھا جائے گا۔ ''پَی'' کیسے لکھا جا سکتا ہے؟

دوسری بات ہے اضافت کے لیے ''پے'' پر ہمزہ لکھنے کی۔ جو اشعار میں نے اوپر نسخہ عرشی سے نقل کیے ہیں، اُن میں شروع کے چھے شعروں میں یہ لفظ مع اضافت آیا ہے اور اضافت کے لیے اِسے ''پئی'' اور ''پئے'' لکھا گیا ہے [نسخہ عرشی سے ایسے جو اشعار نقل نہیں کیے گئے، اُن میں بھی اضافت کی یہی صورت پائی جاتی ہے، یعنی ''پئی'' یا ''پئے'']۔ ''پے'' میں ے جزوِ لفظ ہے اور ایسی ے پر ہمزہ لکھنے کو مرزا صاحب نے ''عقل کو گالی دینا'' کہا ہے [مکتوب بہ نامِ تفتہ۔ اضافت کے بیان میں اُس مکمل عبارت کو آگے چل کر نقل کیا جائے گا]۔ مختصر یہ کہ اضافت کی صورت میں اِس کو اِس طرح لکھا جائے گا: پےِ نذرِ کرم، پےِ عرضِ حال، پےِ عبرت۔ درپےِ دیوار و در۔ مفرد صورت میں اِس لفظ کو پے، درپے، اور مرکبِ عطفی کی صورت میں بھی اِسی طرح، مثلاً ''رگ و پے'' لکھا جائے گا۔ نسخہ عرشی میں ''رگ و پَی'' ملتا ہے:

''رگ و پَی میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو

ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے (ص ۲۴۵)

''رگ و پَی'' صحیح صورت نگاری نہیں؛ ''رگ و پے'' لکھا جانا چاہیے تھا۔ ''پے در پے'' اور ''پیاپے'' بھی اِسی طرح مع یاے مجہول لکھے جائیں گے [''پے'' کو ''پی'' لکھنا جدید ایرانی اندازِ نگارش ہے، جس کا اُردو سے کچھ واسطہ نہیں]۔

پےِ ہم، پیہم: یہ مرکب لفظ ہے۔ معین نے فرہنگِ فارسی میں وضاحت کی ہے:

''پی۔ہم: [-.PAY (-E) HAM (PEY] پی در پی، پشت سرہم، بدنبال یکدیگر:

بگفت این وزاں ہفت ، پی ہم بخورد
ازان می پرستان برآورد گرد

عید قدم مبارک نوروز مژدہ داد کامسال تازہ از پی ہم فتحہا شود

(خاقانی)''

اُردو میں اس کی ترکیبی ہیئت برقرار نہیں رہی، یہاں یہ مفرد لفظ کے طور پر مستعمل ہے، اِسی وجہ سے اِسے ''پیہم'' لکھا جاتا ہے۔ اِس لفظ سے متعلق اِس تفصیل کا تعلق مرزا صاحب کے اِس شعر سے ہے، جو نسخہ عرشی میں اس طرح چھپا ہوا ہے:

واں پہنچ کر جو غش آتا پئی ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو (ص ۱۹۵)

کچھ اور کہنے سے پہلے نور اللغات کے اندراج کو نقل کرنا مناسب ہوگا:

''پیہم: پے در پے، متواتر، لگاتار۔ (نوٹ) یہ لفظ بہ اضافت و بلا اضافت دونوں طرح صحیح ہے، لیکن اُردو میں بے اضافت بولتے ہیں۔ غالب نے فارسی کی تقلید میں بہ اضافت باندھا ہے 'واں پہونچکر جو غش آتا.....''۔

دیوانِ غالب کے چوتھے اڈیشن (مطبعِ نظامی کان پور) میں اِس شعر میں ''پی ہم'' ہی چھپا ہوا ہے اور نسخہ لاہور میں بھی ''پی ہم'' لکھا ہوا ہے۔ اِن حوالوں سے بہ ظاہر یہی بات واضح ہوتی ہے کہ مرزا صاحب نے فارسی میں استعمال کے مطابق اِس ''مرکب'' لفظ کو مع اضافت نظم کیا ہے۔ اِس کی تصدیق ہوتی ہے مرزا صاحب کی تحریر سے۔ اِس تحریر میں مرزا صاحب کے اُس قطعے کا حوالہ کئی بار آیا ہے جو انھوں نے نوّاب کلبِ علی خاں کے پاس اپنے خط کے ساتھ بھیجا تھا۔ اِس قطعے کا (جو بہ خطِ غالب ہے) عکس مرقعِ غالب میں شامل ہے (ص ۱۸۱) اِس کے ایک شعر میں یہ لفظ آیا ہے:

ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام

دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پے ہم

مرزا صاحب نے اِسے ''پے ہم'' لکھا ہے۔ یہ قطعی ثبوت ہے اِس بات کا مرزا صاحب نے اِس لفظ کو، اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق مفرد لفظ کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اُنھوں نے اِسے فارسی مرکّب کے طور پر اُسی طرح لکھا ہے جس طرح فارسی میں مستعمل تھا۔

اِس طرح یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ زیرِ بحث شعر میں اِس لفظ کو اُردو میں استعمال کے مطابق ''پیہم'' نہیں لکھنا چاہیے۔ فارسی میں استعمال کے مطابق اور خود مرزا صاحب کے اندازِ نگارش کے مطابق اِس کے دونوں اجزا کو الگ الگ لکھنا چاہیے، اور اِس صورت میں اِسے ''پے ہم'' لکھنا چاہیے، ''پی ہم'' نہیں، یوں کہ اِس کا جزوِ اوّل ''پَے'' ہے، جو مَے، نَے اور شَے کے قوافی میں آتا ہے، اِس بنا پر ''پی ہم'' نہیں، ''پے ہم'' مرجّح املا ہوگا۔ چوں کہ فارسی میں یہ مع اضافت آتا ہے، اِس لیے یہاں بھی مع اضافت آئے گا اور اضافت کے لیے 'پے' پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا، اِسے ''پےِ ہم'' لکھنا چاہیے، جس طرح مثلاً مےِ صاف، لکھا جائے گا اور جس طرح مرزا صاحب کے اِس شعر میں لکھا جائے گا:

پےِ نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا

بہ خوں غلتیدۂ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا

نسخۂ عرشی میں اِس شعر میں بھی ''پئے نذرِ کرم'' ہے (ص ۱۴۶)، مگر یہ ٹھیک نہیں، اِسے ''پےِ'' لکھا جانا چاہیے۔ مختصر یہ کہ زیرِ بحث مطلع میں ''پےِ ہم'' مرکّب کے طور پر آیا ہے اور اِسے اِس شعر میں اِسی طرح لکھا جائے گا [''پئی ہم'' یا ''پیہم'' نہیں لکھنا چاہیے۔]

۱۔ دو باتیں: یہ تو واضح ہے کہ اِس شعر میں ''پے ہم'' لکھنا چاہیے، مگر یہ بات واضح نہیں کہ اِسے مع اضافت ''پےِ ہم'' لکھا جائے، یا بغیرِ اضافت۔ اِس کا وزن ہے: فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن۔ عروضی ضابطے کے مطابق شاعر کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے، تو یہاں دوسرے یا تیسرے رکن میں تسکینِ اوسط کا زحاف لاسکتا ہے۔ اِس زحاف کا مطلب یہ ہے کہ جب تین حرف پیہم متحرک ہوں، تو بیچ کے حرف کو ساکن کیا جاسکتا ہے، اُس صورت میں ''فعِلاتن'' کی جگہ مفعولن آجائے گا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مرزا صاحب نے یہاں اِس زحاف کو استعمال کیا ہے، تو پھر اِسے بغیرِ اضافت ''پے ہم'' لکھنا چاہیے۔ اِس کا وزن ہوگا:

ت ۔ ط ۔ ع: مرزا صاحب نے میاں داد خاں سیاح کے نام خط میں لکھا ہے: ''ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے؛ عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو، اُس کو سمجھنا کہ عربی ہے'' [ادبی خطوطِ غالب، ص ۳۴]۔

صاحب عالم مارہروی کے نام خط میں لکھا ہے: ''کوئی حرفِ متحد المخرج فارسی میں نہیں..... تے ہے، طوے نہیں'' [ایضاً، ص ۲۵]۔ اِسی نقطۂ نظر کی بنا پر تشت، تپاں، تپش جیسے لفظوں کو ط کے ساتھ (طشت، طپش، طپاں) لکھنے سے منع کرتے تھے۔

تامس: ''تامس سافلس معکف صاحب بہادر'' [عکس: آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر فروری ۱۹۶۵ء]۔

تامُّل: مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''اُس کے صحیح کرنے میں کیا تامل ہے'' [عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۳]۔

بعض صاحبان اصرار کرتے ہیں کہ اِس لفظ کو [اور اِس قماش کے جو اور لفظ ہیں، اُن کو بھی] عربی املا کے مطابق مع ہمزہ لکھا جائے، یعنی ''تأمّل''۔ مرزا صاحب نے اِس لفظ کو [اور ایسے دوسرے لفظوں کو بھی] اُسی طرح ہمزہ کے بغیر لکھا ہے، جیسے اُردو میں اِنھیں عام طور پر لکھا جاتا ہے۔ عرشی صاحب نے، املاے غالب کے مطابق، نسخۂ عرشی میں اِس لفظ کو ہر جگہ اِسی طرح لکھا ہے، مثلاً:

..... فاعلاتن فعلاتن، مفعولن فعلن۔ چوں کہ یہ بات ہمارے علم میں نہیں کہ شاعر نے تسکینِ اوسط سے کام لیا ہے یا نہیں، اِس صورت میں ''پے ہم'' لکھنا مرجح ہوگا۔ یہ خیال رہے کہ مرزا صاحب نے محولۂ بالا قطعے کے شعر میں ''پے ہم'' کو بغیرِ اضافت نظم کیا ہے، اِس بنا پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ ممکن ہے اِس شعر میں بھی اسے بغیرِ اضافت نظم کیا ہو، اور اُس صورت میں اِسے بغیرِ اضافت ''پے ہم'' لکھا جائے گا۔ یعنی یہ مان لیا جائے گا یہاں تسکینِ اوسط کے زحاف کی کارفرمائی ہے۔ بہ ہر صورت، یہ پہلو نظر میں رہنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اِس سے پہلے ایک مضمون میں قطعیت کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ اِس شعر میں لازماً تسکینِ اوسط کا زحاف آیا ہے، یوں یہاں ''پیہم'' لکھنا چاہیے۔ مجھے اِس قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں لکھنا چاہیے تھی۔ اور یہ بھی نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ صحیح لفظ ''پیہم'' ہے۔ پے ہم اور پیہم، دونوں صورتیں بجاے خود درست ہیں۔ یہ مضمون میری کتاب ''تدوین۔ تحقیق۔ روایت'' میں شامل ہے۔ اب اُس حصے کو کالعدم سمجھا جائے۔

سادگیِ یک خیال، شوخیِ صد رنگ نقش حیرتِ آئینہ ہے جیبِ تامّل ہنوز

(ص۴۳)

چاکِ گریباں کو ہے ربطِ تامّل ہنوز غنچے میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

(ص۴۴)

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل یک جہاں زانو تامّل درقفائے خندہ ہے

(ص۲۱۵)

نمودِ عالمِ اسباب کیا ہے، لفظِ بے معنی کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامّل ہے

(ص۳۰۶)

ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے فارسی، اُردو کلام میں اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ یہاں ضمنی طور پر یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ تاسّف، متاسّف، متاثّر، متاخّر، توام، جرات، موثّر؛ اِن سبھی لفظوں کو اُردو میں ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں جرات، تامّل، متاخّرین، مونث، موثّر، ہمزہ کے بغیر ملتے ہیں۔ عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب دیوانِ غالب نسخۂ عرشی اور انتخابِ غالب میں اِن لفظوں کو اِسی طرح لکھا ہے۔ محض مزید وضاحت کے لیے ایسی چند مثالیں نسخۂ عرشی سے نقل کی جاتی ہیں:

اسدؔ! یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توَام ہے جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا

(ص۱۶)

[''دعوا'' نسخۂ عرشی کے مطابق نقل کیا گیا ہے]۔

مثلِ گل زخم ہے میرا بھی سناں سے توَام تیرا ترکش ہی کچھ آبستنیِ تیر نہیں

(ص۵۷)

بہ صورت تکلّف، بہ معنی تاسّف اسدؔ! میں تبسّم ہوں پژمردگاں کا

(ص۱۸)

شوق، مفتِ زندگی ہے، اے بہ غفلت مردگاں ہاتھ پر ہو ہاتھ، تو دستِ تاسّف ہی سہی
(ص ٦٦)

بہ پشتِ دست بدنداں گزیدنست، تحسپ تو محوِ خواب و سحر در تاسّف از انجم
(انتخابِ غالب، ص ٢٩)

دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا آہ وہ جُرات فریاد کہاں
(نسخۂ عرشی، ص ١٥٢)

کیا سزا ہے میرے جرمِ آرزو تاویل کی نالہ کھینچا ہے، سراپا داغِ جُرات ہوں اسدؔ
(نسخۂ عرشی، ص ٩١)

حُسن کو تغافل میں جُرات آزما پایا سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
(نسخۂ عرشی، ص ١٤٣)

شوقِ فضول و جُراتِ رندانہ چاہیے اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
(نسخۂ عرشی، ص ٢١١)

[نسخہ لاہور میں بھی ہر جگہ ''جرات'' ہی ہے: ص ٤، ١٩، ٨٦]۔ کلامِ غالب میں اِن سب لفظوں کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔

تَپ۔ تَب: یہ دونوں لفظ بھی مرتبِ کلامِ غالب کی توجہ کے طلب گار رہیں گے۔ تب اور تپ، دونوں لفظ بخار کے معنی میں مستعمل رہے ہیں۔ ''تب'' بُخار کے سوا، حدّت، گرمی، حرارت کے معنوں میں بھی آتا ہے، مولفِ بہارِ عجم نے لکھا ہے: ''تب، مخففِ تاب، بہ معنیِ حرارت است۔ پس اطلاقِ آں بر حُمّی بر سبیلِ مجاز بود''۔ مرزا صاحب کی اُردو تحریروں میں بُخار کے لیے ''تپ'' ملتا ہے۔ اِس کی تین مثالیں میرے سامنے ہیں۔ مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں میں یہ دو بار آیا ہے، ایک جگہ مفرد طور پر اور ایک جگہ ترکیبی صورت میں: ''ناگاہ تپِ مُحرق نے اُسے گھیرا۔۔۔نہ تپ اُترتی ہے، نہ شانے کا درد جاتا ہے'' [مرقعِ غالب، ص ٢٥٢]۔ نواب ناظم کے نام ایک خط میں بھی یہ ملتا ہے: ''تپ نے آگھیرا، کئی باریاں ابھگتیں'' [عکس: ایضاً، ص ٢٠٣]۔

نسخۂ عرشی میں شامل اِن اشعار کو دیکھیے، جن میں ''تب'' آیا ہے:

نالہ ہا حاصلِ اندیشہ، کہ جوں کشتِ سپند دلِ ناسوختہ، آتش کدۂ صدتب تھا

(ص۲۴)

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

(ص۱۷۲)

وہ تبِ عشق تمنّا ہے، کہ پھر صورتِ شمع شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

(ص۲۰۹)

کیجیے بیاں سُرورِ تبِ غم کہاں تلک ہر مو، مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے

(ص۲۰۵)

اِن اشعار میں ''تب'' حدّت، حرارت، آنچ کے مفاہیم میں آیا ہے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ بُخار کے معنی میں اُردو میں مرزا صاحب نے ''تب'' کہیں لکھا ہے۔ ''تپ'' کی مثالیں تو موجود ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھّی جائے گی کہ مرزا صاحب نے ''تپ'' کو بُخار کے معنی میں بہ ترکیبِ فارسی بھی لکھا ہے۔ مختلف مقامات پر اِن دونوں لفظوں کے معنوی اور املائی فرق کو نظر میں رکھ کر تعیّن کرنا ہوگا۔

تپانچہ (طمانچہ): مقدّمہ مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے لکھا ہے:

> بیتاب نے ''طمانچہ'' لکھا تھا، میرزا صاحب نے ''طمانچہ'' کو ''تپانچہ'' بنا دیا'' [ص۲۲۳]۔

یہ وہی نقطۂ نظر ہے کہ فارسی لفظوں میں ت لکھنا چاہیے، ط نہیں لکھنا چاہیے لیکن نسخۂ عرشی کے اِس شعر میں ''طمانچہ'' چھپا ہوا ہے:

صبا، لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

(ص۳۰۵)

نسخۂ عرشی کی اشاعتِ ثانی میں اسے 'طپانچے' بنا دیا گیا ہے، یعنی: 'صبا، لگا وہ طپانچے

طرف سے بلبل کی (ص ۴۲۷) مگر اِس تبدیلی کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ طپانچے ہو یا طمانچہ، فرمودۂ غالبؔ کے مطابق اور منقولہ اصلاحِ غالبؔ کے مطابق یہ دونوں املا درست نہیں۔ غالبؔ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ فارسی لفظوں میں طؔ نہیں لکھنا چاہیے۔ یہاں لازماً ''تپانچہ'' یا ''تپانچے'' لکھا جانا چاہیے تھا۔

تپیدن، تپش، تپاں: مرزا صاحب نے پنج آہنگ میں لکھا ہے:

> ''تپیدن: تڑپھنا۔ تپید، تپیدہ، تپد، تپندہ، تپ۔ امرِ ایں بہ معنیِ حقیقی مسموع نیست، ونوشتن بہ طاے حطّی خطاست'' (ص ۱۰۴)۔

فرمودۂ غالبؔ کے مطابق کلامِ غالبؔ میں ''طپش'' یا ''طپاں'' لکھنا درست نہیں ہوگا۔

تراز (طراز): فارسی میں 'تراز' ہے۔ ''طراز'' اِس کی معرّب صورت ہے۔ لغات میں اس کی تفصیل مندرج ہے [برہانِ قاطع، غیاث اللغات، فرہنگِ فارسی]۔ غیاث اللغات میں مختلف فرہنگوں کے حوالے یک جا کردیے گئے ہیں۔ مرزا صاحب نے پنج آہنگ میں وضاحتاً لکھا ہے کہ ''ترازیدن'' کے مشتقات میں طؔ نہیں لکھنا چاہیے:

> ''ترازیدن، ترازید، ترازیدہ، ترازندہ، تراز، املاے ایں بہ طاے حطّی جائز نیست'' (ص ۱۰۵)۔

اِس وضاحت اور قطعیّت کے پیشِ نظر یہ بات طے شدہ ہونا چاہیے تھی کہ مرزا صاحب کے کلامِ نظم ونثرِ فارسی واُردو میں ''طراز'' اور ''طرازی'' نہیں لکھے جاسکتے، مگر اس طرف کماحقہٗ توجہ نہیں کی گئی۔ اِس سلسلے میں دیوانِ غالبؔ صدی اڈیشن، مرتبہ مالک رام، نسخۂ عرشی اور نسخۂ رضا، سب کا احوال ایک جیسا ہے۔ نسخۂ عرشی میں ''تراز'' اور ''طراز'' دونوں املا ملتے ہیں، اِس فرق کے ساتھ کہ ''تراز'' صرف ایک شعر میں ہے اور باقی اشعار میں ''طراز'' اور ''طرازی'' مرقوم ہیں:

مگر وہ شوخ ہے طوفاں طرازِ شوقِ خوں ریزی
کہ در بحرِ کماں بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا

(نسخہ عرشی، ص ۳۰)

عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا

(نسخہ عرشی، ص ۲۶)

شوق ہے ساماں ترازِ نازشِ اربابِ عجز ذرّہ، صحرا دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا

(نسخہ عرشی، ص ۱۴۹)

[نسخہ لاہور میں بھی ''تراز'' ہے۔ص ۸۴]۔

کاتبِ حکم نے بہ موجبِ حکم اِس رقم کو دیا طرازِ دوام

(نسخہ عرشی، ص ۱۳۸)

بندہ پرور! ثنا طرازی سے مدّعا، عرضِ فنِ شعر نہیں (ایضاً، ۲۸۱)

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

(نسخہ عرشی، ص ۲۲۵)

[نسخۂ لاہور: سازِ چمن ترازیِ داماں کیے ہوئے، ص ۲۴۷]۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال پھر مہ و خرشید کا دفتر کھلا

(نسخہ عرشی، ص ۱۴۰)

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

(نسخہ عرشی، ص ۱۲۷)

اے وہم طرازانِ حقیقی و مجازی عشاق، فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں

(نسخہ عرشی، ص ۲۹۹)

وقتِ حُسن افروزیِ زینت طرازانِ چمن   از نہالِ شمع پیدا غنچۂ گُل گیر ہے
(نسخۂ عرشی، ص ۹۵)

غالبم اسمِ شعر و نامِ منست   اسداللہ خانِ مدح طراز
(مکاتیبِ غالب، ص ۱۳۲)

نقشِ بہ ضمیر آمدہ نقش طرازم   حاشا کہ بود دعویِ پیدائیِ خویشم
(انتخابِ غالب، ص ۱۳۲)

زہے شکوہِ تو اندر طرازِ صورتِ تو   زخود برآمدنِ صورت آفریں پیداست
(انتخابِ غالب، ۴۳)

چمن طرازِ جنونیم و دشت و کوہ از ماست   بہ مُہر داغِ شقایق بود قبالہ ما
(انتخابِ غالب، ص ۱۷)

قاضی عبدالودود صاحب نے قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ کو مرتب کیا ہے، اُس میں بھی ''طراز'' اور ''طرازد'' مرقوم ہیں [ص ۲۶۔ص ۳۲]۔ لیکن سب سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ خود مرزا صاحب نے ایک جگہ ''طراز'' اپنے قلم سے لکھا ہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام ایک خط میں لکھا ہے: ''نوازش نامۂ ربوبیت طراز مورخہ ۱۱؍ مارچ ۱۸۶۳ء ۱۴ ماہ مذکور کو میں نے پایا'' [مرقومہ ۱۶؍ مارچ ۱۸۶۳ء۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۲۳]۔ مرزا صاحب کے اُس واضح قول کے بعد اِس ''طراز'' کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ لمحہ بے خیالی میں یہ ''نقشِ باطل'' اُن کے قلم سے بن گیا۔ اِسے سند نہیں بنایا جاسکتا اور نظیر کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ قاعدہ یہی رہے گا کہ مرزا صاحب کے اُردو، فارسی کلامِ نظم و نثر میں ''ترازیدن'' کے جملہ مشتقات کو ت کے ساتھ لکھا جائے، یوں کہ اُنھوں نے واضح طور پر اور قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ: ''املاے ایں بہ طاے حطّی جائز نیست'' [یہ واضح رہے کہ یہاں املاے غالب پر گفتگو کی جا رہی ہے، اُردو کے عام طریقِ املا سے بحث نہیں کی گئی ہے]۔

تڑپھنا: قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا

ہے: ''تڑپھنا، ترجمہ تپیدن کا املا یوں ہے، نہ تڑپنا۔ بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے'' [خطوطِ غالب، ص ۱۲۱]۔ نسخۂ عرشی کے یہ شعر اس لحاظ سے توجہ طلب ہیں:

خوں دل میں جو میرے نہیں باقی، تو پھر اس کی　　جوں ماہیِ بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت

(ص ۳۲)

جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا، اسدؔ　　ورنہ بسمل کا تڑپنا، لغزشِ مستانہ تھا

(ص ۲۵)

قولِ غالبؔ کے پیشِ نظر ''تڑپنا'' اور ''تڑپتی'' صحیح املا نہیں۔ ''تڑپھنا'' اور ''تڑپھتی'' ہونا چاہیے۔ مرزا صاحب کی نظم و نثر میں اِس مصدر کے سبھی مشتقات کو مع ہائے مخلوط لکھا جانا چاہیے: تڑپھنا، تڑپھتا، تڑپھا، تڑپھتی ہے، تڑپھے گا (وغیرہ)۔

تشت: مکتوب بہ نامِ سیاحؔ میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''جس طرح عین فارسی میں نہیں، ہے، طوئے بھی نہیں ہے۔ مثلاً ''تشت'' لغتِ فارسی الاصل ہے، املا اِس کی طوئے سے غلط ہے'' (ادبی خطوطِ غالب، ص ۱۳۴)۔

انتخابِ غالب (مرتبۂ عرشی صاحب) کے اِس شعر میں (صحیح طور پر) ''تشت'' ہی لکھا ہوا ہے:

از مہرِ جہانتاب امیدِ نظرم نیست　　ایں تشتِ پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز

(ص ۱۰۵)

لیکن دیوانِ غالبؔ اُردو نسخۂ عرشی کے اِس شعر میں ''طشت'' چھپا ہوا ہے:

شب کہ تھا نظارگی روے بتاں کا اے اسدؔ
گر گیا بامِ فلک سے صبح طشتِ ماہتاب

(ص ۳۱)

مرزا صاحب کے الفاظ میں ''املا اِس کی طوئے سے غلط ہے''۔ ''تشت'' ہونا چاہیے۔ ایک بات اور: ''ماہتاب'' کی جگہ ''ماہ تاب'' لکھا جانا چاہیے تھا اور یہ خود مرزا صاحب کی ایک

اصلاح پر مبنی ہے۔ اُن کے ایک معروف دوغزلے کی پہلی غزل کا مقطع ہے:

غالبؔ! چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہ تاب میں

نسخۂ عرشی میں یہاں ''ماہ تاب'' ہی ہے (ص ۱۸۹)۔ اِس شعر سے متعلق عرشی صاحب نے ضمیمۂ اختلافِ نسخ میں لکھا ہے: ''تمام نسخے: ''ماہتاب'' مگر قد میں غالبؔ نے اپنے قلم سے ''ماہ تاب'' بنایا ہے'' (ص ۴۴۴) اور اِسی بنیاد پر عرشی صاحب نے اِس مقطعے کے متن میں ''ماہ تاب'' رکھا ہے۔ اِس بنا پر اِس شعر میں بھی ''تشتِ ماہ تاب'' لکھا جانا چاہیے تھا۔ چوں کہ عرشی صاحب نے مرزا صاحب کی اِس اصلاح کو تسلیم کیا ہے اور اُس کی مطابقت میں ''ماہ تاب'' لکھا ہے، اِس لیے یہ لازم آئے گا کہ کلامِ غالبؔ میں ہر جگہ اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جائے۔ یا پھر وضاحت کی جائے کہ غالبؔ کی اپنے کلام پر یہ املائی تصحیح قابلِ قبول نہیں اور تب اِس شعر میں اور باقی مقامات پر ''ماہتاب'' لکھا جائے۔ مرتّبِ کلامِ غالبؔ کو اِس سلسلے میں کوئی ایک طریقِ املا اختیار کرنا ہوگا اور اُس کی وضاحت کرنا ہوگی۔

تقاضا۔ تماشا: اِن دونوں لفظوں کا یہی املا مرزا صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے (صحیح املا بھی یہی ہے)۔ یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ کچھ لوگ لاعلمی کی وجہ سے؛ یا پھر محض ضد میں، کہ وہ لازمۂ جہالت ہے؛ اِن کا صحیح املا ''تقاضہ'' اور ''تماشہ'' سمجھتے ہیں۔ مختلف چھپی ہوئی کتابوں میں، خاص کر نصابی کتابوں میں، کم استعداد کاتبوں کے بنائے ہوئے اِن نقوشِ باطل کو بجائے خود صحیح سمجھتے ہیں۔ اِس غلط فہمی اور پھر کج بحثی میں بہت سے اساتذۂ کرام بھی برابر کے حصّے دار ہوتے ہیں۔

ایسے معدودے چند لفظ ہیں جن کے آخر میں حقیقتاً الف ہے، مگر غلطی سے الف کی جگہ ہائے مختفی لکھ دی جاتی ہے، جیسے: تمغا، سقّا، شوربا، ناشتا، معمّا [کہ اِن کو لاعلمی کی وجہ سے] مع ہائے مختفی معمّہ، ناشتہ، تمغہ، سقّہ بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی تحریروں میں اِن کا صحیح املا ملتا ہے، نیز اُنھوں نے اشعار میں اِن لفظوں کو اِس طرح نظم کیا ہے کہ صحیح املا سامنے آجاتا ہے۔ چوں

کہ اِن لفظوں میں کسی طرح کا حقیقی اختلافِ املا نہیں، اور یوں بھی کہ مرزا صاحب نے اِن کو ہمیشہ صحیح طور پر لکھا ہے، اِس لیے محض دو تین مثالوں پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا:

''حسین علی خاں کی سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۷۹)۔

''اُس میمنت وشکوہ سے علاوہ ایک تماشا نیا دیکھا'' (عکسِ مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم۔ مرقعِ غالب، ص ۲۰۳)۔ ع: تماشاے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔ تقاضاے بیہودۂ نے فروش۔

تمر۔ تیمور۔ (طیمور): بیتاب رام پوری کا مصرع تھا: ''رشک کھانے لگے مرقد میں امیرِ طیمور''۔ مرزا صاحب نے اِس مصرعے کو قلم زد کر دیا اور یہ حاشیہ لکھا: ''یہ لفظ طوے سے نہیں، تے سے ہے۔ اور پھر تیمور بروزنِ طنبور نہیں، دراصل تِمُر، بروزنِ ''سہ دُر'' ہے۔ لکھتے ہیں تیمور، اور پڑھتے ہیں، تِمُر۔ اور، تِمُر، ترکی میں فولاد کو کہتے ہیں'' (مکاتیبِ غالب، ص ۱۰۴)۔

خود مرزا صاحب نے ''تمر'' اور ''تمریہ'' لکھا ہے: ''سلاطینِ تمریہ میں دو شخص صاحبقران کہلائے: امیر تمر اور شاہجہاں'' (مکتوب بہ نامِ مولوی نعمان احمد۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۴۵۳)۔ نوّاب کلبِ علی خاں کی مدح میں مرزا صاحب کا ایک فارسی قصیدہ ہے جسے عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب میں نقل کیا ہے متعلقہ خط کے ساتھ، اُس میں ایک شعر یہ ہے:

چراغِ دودۂ سرور علی محمد خاں گزیں ہمالِ تمر درفنِ سپہداری

مرزا صاحب کے کلام میں ''تمر'' اور ''تیمور'' دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے، البتہ مرجّح صورت ''تمر'' رہے گی۔ اگر ''تیمور'' لکھا جائے گا، تو مرزا صاحب کی صراحت کے مطابق، پڑھنے میں ''تِمُر'' آئے گا بہ کسرِ اوّل وضمِ دوم۔

توَام: دیکھیے ''تامُل''۔

تومان۔ تمن: ''لفظِ ترکیست، ودر تحریرِ لغاتِ ترکی اعراب بالحروف نوشتن رسم افتادہ است۔

واو، علامتِ ضمۂ تاے فوقانی، و الف، علامتِ فتحۂ میم۔ ہر آئینہ "تومان" نویسند و "تمن" خوانند به تاے مضموم و میمِ مفتوح۔ و تمن در ترکی بیست را گویند" (قاطع، ص ٦٤)۔

تیار (طیّار): قدر بلگرامی کے نام خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

"طیّار، صیغہ مبالغے کا ہے، لغتِ عربی، املا اس کی طاے حطّی سے۔ "طیر" ثلاثی مجرّد۔ طائر فاعل، طیور جمع۔

باز داروں میں اِس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی: طوے، تے بن گئی۔ یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا، بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ: "فلاں باز، فلاں شکرہ طیّار شدہ است و صید میگیرد"۔

بہ ہر حال، اب تاے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا۔ اِس لفظ کو مستحدث اور دراصل اُردو اور بہ تاے قرشت بہ معنیِ آمادہ، اشخاص اور اشیا پر عام تصوّر کرنا چاہیے۔ اور عبارتِ فارسی میں استعمال اِس کا کبھی جائز نہ ہوگا" (خطوطِ غالب، ص ۱۸۳)۔

مرزا صاحب نے اُردو میں "تیار" اور "تیاری" ہی لکھا ہے۔ صرف دو مثالیں: "اب آپ اِس کو جلد تیار کروائیے" [مکتوب بہ نامِ حکیم غلام نجف خاں۔ عکس: رسالہ آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر، فروری ۱۹٦۵ء]۔ روپیہ مل جائے تو اِس مہینے میں تیاری ہو رہی ہے" (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلب علی خاں، عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۷۵]۔

ٹھہرنا (ٹھیرنا): ٹھہرنا، ٹھہرنا، ٹھیرنا؛ اِس مصدر کے یہ تین املا مروّج رہے ہیں، مگر مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں صرف "ٹھہرنا" کے مشتقات ملتے ہیں۔ عرشی صاحب نے مقدّمہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے:

"ٹھہرنا"، دہلی میں "ٹھہرنا" بولا جاتا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ میرزا صاحب ہمیشہ ایک ہ سے لکھتے ہیں۔ ناظم نے لکھا تھا: جو آگئے

ہو مرے گھر، تو کوئی دم ٹھیرو۔

مرزا صاحب نے اِسے "ٹھہرو" بنا دیا۔ بیتابؔ کا شعر تھا:

کیسا مزہ دکھاتے ہیں ہم بھی، تو ٹھیر جا

تقریریں کر کے اور یہ ناصح تو ہل گیا

اِس میں مرزا صاحب نے "ٹھہر تو جا" اصلاح دی" (ص ۲۲۹)۔

اِن اصلاحوں سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا صاحب "ٹھہرنا" کو صحیح (یا فصیح) سمجھتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ "ٹھیرو" کو "ٹھہرو" اور "ٹھیر جا" کو "ٹھہر تو جا" کیوں بناتے۔

مرزا صاحب کی خطّی تحریروں میں، جن کے عکس پیشِ نظر ہیں، صرف "ٹھہرنا" کے مشتقات ملتے ہیں۔ مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں میں اُنھوں نے لکھا ہے: "مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا" (عکس مشمولہ مرقعِ غالب، ص ۱۰۰)۔ "لشکر کو لغت ٹھہرانا اور پھر عسکر کو اُس کا معرّب جاننا" (برہانِ قاطع، طبعِ کلکتہ کے ایک صفحے کے حاشیے پر مرزا صاحب کی تحریر۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب)۔ "میں یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا" (مکاتیبِ غالب، ص ۲۸[1])۔ املی کے محلّے میں ٹھہرے ہیں" (عکسِ مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ مشمولہ مرقعِ غالب، ص ۲۹۴)۔

مرزا صاحب کی خطّی تحریروں میں "ٹھٔہرنا" یا "ٹھیرنا" کے مشتقات کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی، اِس بنا پر مرزا صاحب کے کلامِ نظم و نثر میں صرف "ٹھہرنا" کے مشتقات لکھے جائیں گے۔

اِس مصدر کے مشتقات کے املا میں خاصی بے احتیاطی کارفرما نظر آتی ہے۔ مثلاً عرشیؔ صاحب نے مکاتیبِ غالب میں مکتوب ۲۸[2] میں "ٹھہرتا" لکھا ہے، لیکن مکتوب ۳۶، ۸۰ میں "ٹھٔہرے" ہے (ص ۶۴) اور مکتوب ۱۶، ۶۰ میں بھی "ٹھٔہرا" ہے (ص ۴۸)۔

۱۔ یہ اصلاح مکاتیبِ غالب کے ص ۱۰۶ پر بھی نقل کی گئی ہے اور وہاں "مزا" ہے۔

۲۔ مرقعِ غالب اور غالب کے خطوط، دونوں میں اِس خط کا عکس شامل نہیں۔ یہ صراحت بھی نہیں کی گئی کہ کیوں شامل نہیں کیا گیا؛ لیکن یہ مکمل خط مکاتیبِ غالب میں شامل ہے (ص ۲۸، خط ۳۷)۔ مزید اطمینان کی بات یہ ہے کہ عرشیؔ صاحب نے حواشی میں یہ صراحت کر دی ہے کہ اصل خط میں "ٹھہرا" ہی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اصل خط رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ عرشیؔ صاحب کی یہ صراحت حصّہ حواشی میں ص ۱۴۵ پر ہے۔

دیوانِ غالبؔ، نسخہ عرشی کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی ''ٹھہرنا'' اور ''ٹھہرانا'' کے مشتقات ملتے ہیں:

صومعے میں اِسے ٹھہرایئے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

(ص۱۲۲)

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

(ص۲۰۰)

سایہ میرا مجھ سے، مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

(ص۲۲۲)

ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

(ص۲۲۵)

اِن اشعار میں بالترتیب ٹھرایئے، ٹھرا، ٹھرا جائے ہے، نہ ٹھرا جائے ہے ہونا چاہیے تھا، خاص کر اُس صورت میں جب وہ مکتوب ۲۸ میں ''ٹھرتا'' لکھ چکے تھے۔ مرزا صاحب کے کلامِ نظم ونثر میں التزام کے ساتھ ''ٹھرنا'' اور ''ٹھرانا'' کو اصل مانا جائے گا اور انھی کے مشتقات کو لکھا جائے گا۔

ہاں یہ لکھنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر معین الرّحمان نے پچھلے سال (۱۹۹۸ء میں) دیوانِ غالبؔ کے اُس نسخے کو شائع کیا ہے جو لاہور میں تھا۔ اُنھوں نے یہ بڑا کام کیا کہ اصل نسخے کے مکمّل صفحات کا عکس شامل رکھا۔ اِس نسخے میں منقولہ بالا چار اشعار میں سے دو شعر ملتے ہیں اور اُن میں ''کس سے ٹھرا جائے ہے'' (ص۷۰) اور ''نہ ٹھرا جائے ہے

مجسے'' (ص ۹۳) لکھا ہوا ہے۔ یعنی اِس نسخے کے کاتب نے مرزا صاحب کے املا کی پابندی کی ہے۔

جاداد: ''پرگنہ جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا، وہ اُس کی جاداد[1] میں مقرّر تھا'' (خودنوشت حالات۔ عکس مشمولہ مرقّعِ غالب، ص ۲۹۷)۔ ''خواہ از املاکِ متروکہ وخواہ از جادادِ خاصِ خود'' [دستاویزِ قرض بہ خطِ غالب، عکس: آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر، فروری ۱۹۵۲ء)۔

جَبْہَہ: تفتہ کا مصرع تھا: نورِ سعادت از جبہ قاصدم چکد۔ مرزا صاحب نے بہ ذیلِ اصلاح لکھا: ''جبہہ بروزنِ چشمہ[2] ہے، یعنی دو ہائے ہوّز ہیں... ایک ہائے ہوّز کہاں گئی'' (خطوطِ غالب، ص ۸۱)۔

جُرات: ''ناچار جرات بہم پہنچا کر اِس عرضداشت کے جواب میں ان حالات کے انکشاف کا اُمید وار ہوں'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۵۹)۔ اِس سلسلے میں مزید دیکھیے ''تامّل''۔ اِن دونوں لفظوں میں مرزا صاحب نے الف پر ہمزہ نہیں لکھا (جو عربی املا کے مطابق ہوتا)۔ اُردو میں عموماً اِسی طرح (ہمزہ کے بغیر) لکھتے ہیں اور مرزا صاحب نے بھی اِن لفظوں کو اِسی طرح لکھا ہے۔

جرنیل: ''جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد آئے'' (خودنوشت حالات۔ عکس مشمولہ مرقّعِ غالب، ص ۲۹۷)۔ ''جرنیل صاحب نے'' (ایضاً)۔ ''جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے'' (ایضاً)۔ ''درعہدِ جرنیل صاحب والا مناقب جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر'' [عرضیِ مرزا

۱۔ جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
(نسخہ عرشی، ۲۰۶)

۲۔ شرم آئینہ تراشِ جبہہ طوفان ہے — آپ گردیدن روا، لیکن چکیدن منع ہے
(نسخہ عرشی، ص ۱۱۲)

حیف اے ننگِ تمنا، کہ پے عرضِ وفا — یک عرق آئنہ برجبہہ سائل باندھا
(ایضاً، ص ۱۴)

غالب (بہ خطِ غالب)۔ عکس مشمولہ نامہ ہای فارسیِ غالب، مقابل ص ۱۱۶]۔ ''رپوٹے کہ جناب جرنیل صاحب والامناقب جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر'' (ایضاً)۔

جھوکا: ''بیٹا، تیرے سر کی قسم، اگر میں لنگ باندھے ہوئے ننگا بیٹھا ہوں، تو میری شکل آکھ کی بڑھیا کی سی ہوگی۔ شاید ہوا کے جھوکے سے اوڑ جاؤں'' (مکتوب بہ نامِ محمود میرزا۔ عکس مشمولہ غالب کے خطوط، ص ۷۳۵)۔

مرزا صاحب نے ''جھوکے'' بغیر نونِ غنہ لکھا ہے۔ یہ لفظ مع نونِ غنہ اور بغیر نونِ غنہ، دونوں طرح مستعمل رہا ہے، مگر فرہنگِ آصفیہ میں مستعمل لفظ کے طور پر ''جھوکا'' ہے۔ اُس میں ''جھونکا'' بھی ہے، مگر اس کے تحت لکھا گیا ہے: ''دیکھیے جھوکا''۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے نزدیک مستعمل اور مرجح لفظ ''جھوکا'' ہے (بغیر نونِ غنہ)، اور اِس اندراج سے دہلی میں اِس لفظ کے چلن سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے بھی اِسے بغیر نونِ غنہ لکھا ہے، اس بنا پر اُن کے کلامِ نظم و نثر میں اس لفظ کو اسی طرح (بغیر نونِ غنہ) لکھا جانا چاہیے۔

ہاں ''جھونکنا'' کو مرزا صاحب نے مع نونِ غنہ ہی لکھا ہے: ''کتاب خانے پارس کے چولھے میں جھونکے گئے'' (مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۴۸ کے مقابل)۔

مُجرو: ''مگر یہ چار مجرو[1] کا رسالہ، جواب بھیجا ہے، اِس کا دیکھنا ضرور درکار ہے'' (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب، ص ۲۱۴)۔ عرشی صاحب نے مقدمہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے:

> ''میرزا صاحب عربی الفاظ کا املا ایرانیوں کے انداز پر لکھتے تھے۔ بیتاب نے ایک شعر میں 'مجزِ لاینفک' لکھا تھا، میرزا

۱۔ ہے بوے گل غریبِ تسلّیِ گنجِ وطن ہر مجزوِ آشیاں، پرِ پرواز ہے مجھے (نسخہ عرشی، ص ۹۷)

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم ہمچو موئے کہ بتاں را زمیاں برخیزد (انتخابِ غالب، ص ۱۷)

صاحب نے انھیں بتایا کہ بجاے اِس کے ''جزوِلاینفک'' لکھنا چاہیے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کا اِس لفظ کو سہ حرفی بتانا درست ہے، لیکن اِس کے آخر میں ہمزہ کی جگہ واو لکھنا عجمیوں کا دستور ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم لکھتے ہیں:

''تبدیلِ حرف، چنانکہ در ''بدء'' بمعنیِ ابتدا کردن و آغاز، ہمزۂ آخر را بہ واو بدل کردند۔ وہم چنیں در ''جزء'': پارۂ چیزے، بجاے ہمزہ واو نویسند و خوانند۔ مگر بشرطے کہ آں را مضاف نمایند، چوں: جزوِ کتاب، و جزوِ بدن۔ والاّ در عبارتِ پارسی بدونِ ہمزہ نویسند'' (ص ۲۳۱)۔

عرشی صاحب نے نجم الغنی خاں کے اِس اقتباس کے لیے حاشیے میں نجم الغنی خاں کی کتاب نہج الادب ص ۲۰۸ کا حوالہ دیا ہے۔

جز اور جزو سے متعلق ضروری تفصیلات کے لیے دیکھیے مقالاتِ صدّیقی [ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے مقالات کا مجموعہ] جلدِ اوّل، نیز اُردو املا، ص ۲۷۵۔

چاکو: مرزا صاحب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''تیز چاکو کی نوک سے ''نہیب'' کا لفظ چھیلا جائے اور اُس کی جگہ ''نواے'' لکھ دیا جائے'' (خطوطِ غالب، ص ۴۵)۔

خطوطِ غالب کے مصحّح ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے مقدّمہ کتاب میں ''چاکو'' سے متعلق یہ راے ظاہر کی ہے:

''صحیح ''چاقو'' ہے، جو تُرکی لفظ ہے۔ غالب ظاہرا فارسی ''چاک'' سے مشتق جان کر، اِسے ک سے لکھتے تھے۔ یا شاید اُردو میں ''چاکو'' ہی کو فصیح مانتے ہوں'' (مقدّمہ خطوطِ غالب، ص ی)۔

جو بھی صورت ہو، مرزا صاحب کی تحریر میں ''چاکو'' ہی لکھا جائے گا۔

چانول: مرزا صاحب نے تیغ تیز میں لکھا ہے:

> ''چانول اور چاول کی نظیر غلط۔ ہندی لفظ ہے۔ ثِقات اور شرفا مع النون بولتے ہیں، بنیے بقال بے نون بولتے ہیں''
> (قاطع، ص ۲۸۲)۔

یہ بات کہ مرزا صاحب کے اِس قول کی بجائے خود کیا حیثیت ہے، الگ بحث ہے۔ اُن کی اِس قطعی وضاحت کے بعد اُن کی عبارت میں (اگر یہ لفظ کہیں آیا ہو) چانول ہی لکھا جائے گا۔

چِتّھا: ''سے روپے کا چتّھا ماہوار کا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّع غالب، ص ۲۸۱)۔

چِڑھانا: ''بیتاب کے کاتبِ دیوان نے ''منہ چڑانا'' اور ''پگلنا'' لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے ''چڑھانا'' اور ''پگھلنا'' کر دیا ہے'' (عرشی صاحب: مقدمہ مکاتیبِ غالب، ص ۲۳۰)۔

چھانو: دیکھیے پانو۔

چھاونی: مرزا صاحب نے نوّاب کلبِ علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے: ''دلّی اب شہر نہیں، چھاونی ہے'' (عکس مشمولہ مرقّع غالب، ص ۲۳۰)۔ (ضمنی طور پر یہ لکھنا ہے کہ اِس لفظ کا صحیح املا بھی یہی ہے، یعنی واو پر ہمزہ نہیں؛ جس طرح باولی، باولا، اُتاولا جیسے لفظوں میں واو پر ہمزہ نہیں آتا)۔

حلوا: یہ لفظ مرزا صاحب کی کسی خطّی تحریر میں نہیں ملا، البتہ ایک شعر میں یہ اِس طرح نظم ہوا ہے کہ اُس کی بنیاد پر اِس کے املا کا تعیّن بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ شعر یہ ہے:

زخمِ دل پر باندھیے حلواے مغزِ استخواں

تندرستی فائدہ، اور ناتوانی مفت ہے

(نسخۂ عرشی، ص۱۱۴)

مرزا صاحب نے ''حلوا'' نظم کیا ہے اور اِس لفظ کا صحیح املا بھی یہی ہے۔ اِس لفظ سے متعلق یہ وضاحت خاص کر یوں کی گئی کہ اِسے ''حلوہ'' بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

خرج: اصل لفظ یہی ہے، بعد کو اُردو میں اِس نے ''خرچ'' کی صورت میں رواج پایا [جس سے ''خرّاچ'' بنالیا گیا]۔ مرزا صاحب نے اِسے اصل کے مطابق (خرج) لکھا ہے۔ مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''دو سو میں سے سو لے کر ساز و سامان درست کیا ہے اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرجِ راہ کے واسطے رہنے دیے ہیں'' (عکس مشمولہ مرقّعِ غالب، ص۲۲۳)۔ نسخۂ عرشی میں اِن شعروں میں ''خرج'' ہی ہے:

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

(نسخۂ عرشی، ص۱۴۸)

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ

دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہاے لال ہے

(نسخۂ عرشی، ص۲۰۵)

ڈاکٹر معین الرحمان نے نسخۂ لاہور کو پچھلے سال شائع کیا ہے۔ اُنھوں نے اصل نسخے کو عکسی صورت میں پیش کیا ہے (ایک صفحے پر اصل مخطوطے کا عکس، مقابل کے صفحے پر اُس کی نقل)۔ اِس نسخے کا کاتب مرزا صاحب کے طریقِ نگارش سے اچھی طرح آشنا معلوم ہوتا ہے اور اِس کا اندازہ مختلف مقامات پر ہوتا ہے۔ منقولہ بالا دونوں شعر اِس نسخے میں موجود ہیں اور عکس میں دونوں شعروں میں ''خرج'' ہی ہے (ص۲۷۔ ص۱۷۰)۔ یہ گویا مرزا صاحب کے املا کی پابندی ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں اِس لفظ کا یہی املا اختیار کیا جانا چاہیے، یعنی ''خرج''۔

(ایک ضمنی بات۔ مولفِ غیاث اللغات نے اِس لفظ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے ''خرج'' کے ''خرچ'' کی صورت میں مستعمل ہونے کی کیفیت صحیح طور پر معلوم ہوتی ہے۔اُن کی عبارت یہ ہے:

> ''خرج: بالفتح ،جیمِ عربی.....و بہ جیمِ فارسی از غلطی ست ،مگر حالا از کثرتِ استعمالِ مردم عیبِ آں مستور گشت''۔

صاحبِ بہارِ عجم نے ''خرچ'' کو غلط بتایا ہے، لکھا ہے: ''و بنا بر مشہور بہ جیمِ فارسی غلطِ عوام کالانعام است''۔ مرزا صاحب نے اِس ''غلط العوام'' کے مقابلے میں اصل لفظ ''خرج'' کو اختیار کیا ہے۔

خُردہ (خوردہ): مرزا صاحب نے مولفِ برہانِ قاطع پر اعتراض کرتے ہوئے تیغ تیز میں لکھا ہے:

> ''جو الفاظ واوِ معدولہ سے ہیں اور جو بے واو ہیں، دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ مثلاً ''خوردہ'' بہ واو، جو صیغۂ مفعول ہے خوردن کا، اور ''خُردہ'' بہ خاے مضموم بے واو، جو ترجمہ ہے دقیقہ کا، اور نقدی کو بھی کہتے ہیں؛ اِن دونوں کا تفرقہ اُٹھا دیا ہے'' [قاطع ،ص ۲۶۵]۔

مرزا صاحب نے جس املائی بے امتیازی کے لیے مولفِ برہانِ قاطع پر اعتراض کیا ہے، وہ اُردو میں آج بھی عام ہے۔ آج بھی احوال یہ ہے کہ بہت سے لوگ ''خُرد'' کو ''خورد'' لکھنے میں تکلف نہیں کرتے۔ ''خورد وکلاں'' اور ''خورد وبزرگ'' جیسے ٹکڑے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ ''خورد'' تو خوردن مصدر کا ماضیِ مطلق ہے، جس کے معنی ہیں: کھایا۔ ''خورد ونوش'' میں یہی ''خورد'' ہے۔ اور ''خُرد'' بزرگ کی ضد ہے۔ ''خردہ'' کے معنی ہیں: چھوٹا ٹکڑا، ریز گاری۔

ہمیں عام طور پر اور کلامِ غالب کے سلسلے میں خاص طور پر اِن دو مختلف لفظوں میں املائی امتیاز کو لازماً ملحوظ رکھنا چاہیے۔

خُرسند: اِس لفظ میں واوِ معدولہ شامل نہیں (برہانِ قاطع - فرہنگِ فارسی)۔ غیاث اللغات میں تو یہ صراحت کردی گئی ہے کہ اِس میں واو لکھنا غلط ہے: "بالضم، بدونِ واو.... و بواو نوشتن خطاست۔ از موید و سراج و برہان و جہانگیری"۔یہی بات صاحبِ نوراللغات نے لکھی ہے: "خرسند... اِس کا املا واو سے غلط ہے"۔ انتخابِ غالب کے دو شعروں میں یہ دو طرح مرقوم ہے:

نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالبؔ بدیں، کہ پرسد و گویند: ہست، خرسند ست

(ص ۴۷)

قدرِ مشتاقاں چہ داند، دردِ ما چندش بود آنکہ دایم کار بادلہاے خورسندش بود (ص ۹۵)

اِس اختلافِ املا کی وجہ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بہ لحاظِ املا اہم الفاظ کا گوشوارہ مرتّب نہیں کیا گیا۔ اِس لفظ کا صحیح املا "خُرسند" ہے۔

خرشید۔ خور: میر مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

"وہ پارسیِ قدیم، جو ہوشنگ و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی، اُس میں "خُر" بہ خاے مضموم، نورِ قاہر کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے، آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے، اِس واسطے آفتاب کو "خُر" لکھا اور "شید" کا لفظ بڑھادیا۔ "شید" بہ شینِ مکسور و یاے معروف، بروزنِ عید، روشنی کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ اُس نورِ قاہرِ ایزدی کی روشنی ہے۔ "خُر" اور "خُرشید[۱]" یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھہرے[۲]۔

۱۔ خطوطِ غالب میں "خورشید" ہے؛ مگر یہ بہ ظاہر کمپوزنگ کی غلطی ہے (اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرتّب نے اِسی طرح لکھا ہو)۔ مرزا صاحب نے تو یہ لکھا ہے کہ "خُر" اور "شید" کا مرکّب "خرشید" ہے۔ "خورشید" کا یہاں محل نہیں۔ اِسی بناپر "خرشید" لکھا گیا ہے۔ خطوطِ غالب کے دوسرے (اضافہ شدہ) اڈیشن میں، جس پر مرتّب کے طور پر مالک رام صاحب کا نام لکھا ہوا ہے، یہ جملہ اشاعتِ اوّل کے مطابق ہے۔ غالب کے خطوط ....

جب عرب و عجم مل گئے، تو اکابرِ عرب نے، کہ وہ منبعِ علوم ہوئے، واسطے دفعِ التباس کے ''خر'' میں واوِ معدولہ بڑھا کر ''خور'' لکھنا شروع کیا۔ ہر آئینہ[۳] متاخرین نے اِس قاعدے کو پسند کیا اور منظور کیا، اور فی الحقیقت یہ قاعدہ مستحسن ہے۔

فقیر ''خر'' جہاں بے اضافہ لفظِ ''شید'' لکھتا ہے، موافقِ قانونِ عظمائے عرب بہ واوِ معدولہ لکھتا ہے، یعنی ''خور''۔ اور جہاں بہ اضافہ لفظِ ''شید'' لکھتا ہے، وہاں بہ پیرویِ بزرگانِ پارسی سر بہ سر لفظِ ''خور'' کو بے واو لکھتا ہے، یعنی ''خرشید''۔

''خور[۱]'' کا قافیہ ''در'' اور ''بر'' کے ساتھ جائز اور روا ہے، خود میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا، وہاں میں بے واو کیوں لکھوں۔ رہا ''خورشید''، چاہو بے واو لکھو، چاہو مع الواو لکھو۔ میں بے واو لکھتا ہوں، مگر مع الواو کو غلط نہیں جانتا۔ اور ''خر'' کو کبھی بے واو نہ لکھوں گا، قافیہ ہو یا نہ ہو۔ یعنی نظم میں وسطِ شعر میں آپڑے، یا نثر کی عبارت میں واقع ہو، ''خور'' لکھوں گا۔

میں یہ جملہ اِس طرح ہے: ''خر'' اور ''شید'' یہ دونوں اسم ''آفتاب'' کے ٹھہرے'' (ص ۵۴۵)۔

۲۔ خطوطِ غالب میں ''ٹھہرے'' ہے۔ اِسی گوشوارے میں ''ٹھہرنا'' کے تحت یہ تفصیل لکھی جاچکی ہے کہ مرزا صاحب نے ہر جگہ ''ٹھہرنا'' کے مشتقات لکھے ہیں۔ ٹھہرایا ٹھہرے، انھوں نے کہیں نہیں لکھا، اسی بنا پر یہاں ''ٹھہرے'' لکھا گیا ہے۔

۳۔ خطوطِ غالب میں ''ہر آینہ'' ہے۔ اِس سے متعلق ''آئنہ'' کے ذیل میں وضاحت کی جاچکی ہے۔

۱۔ خطوطِ غالب میں ''خر'' ہے، مگر یہ درست نہیں ہوسکتا۔ ''در'' اور ''بر'' کا قافیہ ''خر'' نہیں ہوسکتا۔ غالب کے خطوط کے متن میں بھی یہ جملہ اسی طرح ہے اور اس کے حواشی میں یہ اطلاع دی گئی ہے: ''عودِ اول و عودِ دوم ''خور''۔'' یعنی عودِ ہندی کی اشاعتِ اوّل اور اشاعتِ دوم میں یہاں ''خور'' ہے۔ یہی ہونا بھی چاہیے۔ غالب نے اگلے جملے میں خود صراحت کی ہے کہ ''در'' اور ''بر'' کے قافیے میں خود میں نے ''خور'' لکھا ہے، وہاں، یعنی ایسے قوافی میں بے واو کیوں لکھوں''۔ یعنی مع واو لکھوں گا۔ اس طرح یہ بات قطعی طور پر واضح ہے کہ اس جملے میں ''خور'' کا محل ہے، ''خر'' کا محل نہیں۔ اسی لیے یہاں ''عودِ اوّل و دوم'' کے مطابق ''خور'' لکھا گیا ہے۔ (فارسی میں واوِ معدولہ کے قاعدے کے مطابق ''خور'' قافیہ ہوسکتا ہے دَر اور بَر کا)۔

یہ بات بھی تم کو معلوم رہے کہ جس طرح ''خُر'' ترجمہ قاہر کا ہے، اُسی طرح ''جم'' ترجمہ قادر کا ہے، کہ بہ اضافۂ لفظِ ''شید'' اسمِ شہنشاہِ وقت قرار پایا ہے''[1] (خطوطِ غالب، ص ۲۸۸)۔

مرزا صاحب نے ''خورشید'' کو غلط نہیں کہا، البتہ بہت وضاحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے اور تاکیدی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ میں ''خور'' اور ''خرشید'' لکھتا ہوں؛ اس بنا پر مرزا صاحب کی اُردو، فارسی نظم و نثر میں لازماً اسی کی مطابقت اختیار کی جائے گی، یعنی ''خور'' اور ''خرشید'' لکھیں گے۔ اِن لفظوں کے سلسلے میں مرزا صاحب کی رائے سے اختلاف کیا گیا ہے، اِس کے باوجود مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی وضاحت کے مطابق اِن لفظوں کو لکھا جائے گا۔ نسخۂ عرشی میں اِس کی پابندی کی گئی ہے۔

خُشنود۔ خُشنودی: مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں یہ لفظ اسی طرح ملتے ہیں: ''خشنودی کا طالب غالبؔ'' (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۴)۔ ''خشنودی کا طالب غالبؔ'' (ایضاً، ص ۲۰۸)۔ ''خشنودی کا طالب غالبؔ'' (ایضاً، ص ۱۹۹)۔ ''خشنودیِ مزاج کا طالب غالبؔ'' (ایضاً، ص ۲۲۲)۔ ''حضور کی خشنودی کا طالب'' (ایضاً، ص ۲۲۴)۔ ''مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے آپ کی خوشی اور خشنودی مراد ہے'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۳۷)۔ ''میں خشنودیِ مزاجِ مبارک سے اطلاع

۱۔ ''خُر'' اور ''خُرشید'' سے متعلق مرزا صاحب کے منقولہ بالا قول کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ ایران کی پُرانی زبان میں بعضے لفظوں کا پہلا حرف ساکن ہوتا تھا۔ چنانچہ ''خور'' اور ''خود'' وغیرہ کی خ ساکن تھی اور واو مفتوح۔ یعنی خ، و آپس میں مل کر دُہری آواز پیدا کرتے تھے۔ آگے چل کر ابتدا بہ سکون فارسی زبان میں ترک ہوگئی، تو وَ کی تعدیل ہو کر، تلفظ میں صرف ایک ضمہ باقی رہ گیا۔ کتابت میں اب تک وہ معدول واو برقرار ہے۔

عرب کی زبان میں نہ ''خور'' کو دخل ہوا، نہ ''خورشید'' کو، اور نہ ''خُر'' اُن کی زبان میں دخیل تھا، پھر اُن کو التباس کے دور کرنے کی فکر کیوں ہونے لگی'' (مقدمہ خطوطِ غالب، ص ح)۔

پاؤں'' (ایضاً ص ۲۶۷)۔ ''بہت راضی وخشنود ہوئے'' (ایضاً ص ۲۶۰)۔ ''خشنودی کا طالب غالب'' [مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۱۶]۔

اِس صورت میں یہ واضح ہے کہ کلامِ غالب میں اِن دونوں لفظوں کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے، مگر انتخابِ غالب کے اِن اشعار میں ''خوشنود'' ملتا ہے:

خوشنودم از تو و زپےِ دور باشِ خلق آوازۂ جفاے تو در عالم افگنم (ص ۱۳۲)

خوشنود شوی، چوں دلِ خوشنود نیابی ترسم کہ زیاں کارکسی، سود نیابی (ص ۱۷۲)

اِن اشعار میں ''خوشنود'' کس بنیاد پر لکھا گیا ہے، میں نہیں کہہ سکتا۔ اصولاً ''خشنود'' ہونا چاہیے تھا۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ معین نے فرہنگِ فارسی میں ''خوشنود'' اور ''خوشنودی'' کو شامل نہیں کیا، اُس میں صرف ''خشنود'' اور ''خشنودی'' ہے۔ برہانِ قاطع میں بھی ''خوشنود'' مندرج نہیں۔ اُس میں صرف ''خشنو'' ہے، جسے ''مخففِ خشنود'' لکھا گیا ہے۔ ہاں غیاث اللغات اور بہارِ عجم میں ''خوشنود'' ملتا ہے۔

خورّم۔ خُرّم: مرزا صاحب نے ایک قطعہ نوّاب کلبِ علی خاں کی خدمت میں بھیجا تھا، اُس میں یہ شعر بھی ہے:

رام پور ایک بڑا باغ ہے از روے مثال دل کش و تازہ و شاداب و وسیع و خورّم

یہ قطعہ بہ خطِ غالب ہے، اِس کا عکس مرقعِ غالب میں شامل ہے (ص ۱۸۱)۔ مکاتیبِ غالب میں ص ۶۷ پر یہ قطعہ منقول ہے اور وہاں (اصل کے مطابق) ''خورم'' لکھا ہوا ہے۔ یہ قطعہ دیوان میں بھی شامل ہے اور وہاں ''خرم'' لکھا گیا ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۶۵)۔ املا کا یہ اختلاف اُلجھن پیدا کرے گا۔ یہاں بھی ''خورّم'' لکھا جانا چاہیے تھا۔

اِس لفظ کے سلسلے میں ایک بات اور وضاحت طلب ہے۔ عرشی صاحب نے مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں ایک عنوان قائم کیا ہے: ''املا کی غلطیاں''، اُس کے تحت مرزا صاحب کی املائی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ غلطیہاے املا کے بیان میں ''خورم'' کو بھی شامل کیا گیا ہے (ص ۲۳۲)۔ یعنی ''خورّم'' غلط املا ہے، ''خرّم'' صحیح صورت ہے؛ مگر یہ بات قابلِ

قبول نہیں۔ فارسی میں خورّم اور خرّم، دونوں شکلیں ہیں۔ اِسی طرح خرّمی اور خورّمی (فرہنگِ فارسی۔ غیاث اللّغات)۔ اِس لفظ کے ذیل میں مولّفِ غیاث اللّغات کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے: ''خرم.... بدونِ واوِ معدولہ، مگر بہ واو ہم می نویسند، بہ جہتِ کراہیتِ التباس بہ لفظِ ''خر'' و میمِ متکلّم''۔

فارسی میں تشدید لکھنے کا رواج نہ تھا اور نہ ہے۔ اِس طرح مولّفِ غیاث کے قول کے مطابق ''خرم'' کو ''خَرم'' بھی پڑھ سکتے ہیں، جس کے معنی ہیں: میں گدھا ہوں۔ یہ وہی صورت ہے جو ہندستان میں بادشاہ اور پادشاہ کے سلسلے میں پیدا ہوئی (پاد۔شاہ) جس کی بنا پر ''بادشاہ'' نے رواج پایا۔ بہ ہر طور، مرزا صاحب کے کلامِ نظم و نثر میں ''خورّم'' ہی لکھا جانا چاہیے۔ یہ خیال کر لینا کہ مرزا صاحب کو اِس لفظ کا صحیح املا نہیں معلوم تھا، ماننے والی بات نہیں۔

خوراک: نسخۂ عرشی میں ص ۲۲۹ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:

رُونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے   دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہوگئے

اِس غزل میں یہ شعر بھی ہے:

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا   آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

ضمیمہ اختلافِ نسخ میں اِس شعر کے متعلق عرشی صاحب نے لکھا ہے: ''قا میں اِس بیت کی جگہ یہ بیت ہے:

پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق   جوں شمع آپ اپنی وہ خوراک ہوگئے'' (۴۵۸)

اِس میں ''خوٗراک'' آیا ہے (معِ اشباع، بروزنِ مفعول)۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے اِس بیت کو بھی اپنے نسخے کے متن میں شامل کیا ہے اِس نوٹ کے ساتھ: ''میری راے میں دونوں اشعار کی جداگانہ حیثیت ہے، اِس لیے دونوں ہی برقرار رکھے گئے'' (دیوانِ غالب، نسخۂ رضا، ص ۳۰۴)۔ اِس شعر کو شاملِ متن ہونا چاہیے یا نہیں، یہاں یہ بحث غیر متعلق ہے؛ البتہ املا کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اشباع کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور

یہ معمول[1] کے خلاف ہے، اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ واو پر معروف آواز کی علامت ضرور بنائی جائے، یعنی "خوٗراک" لکھا جائے۔ اچھا یہ ہوگا کہ جہاں بھی ایسا کوئی لفظ اشباع کے ساتھ نظم کیا گیا ہو، وہاں واو پر علامتِ معروف ضرور لگائی جائے۔

دست آویز: "ایں خط را کہ من بدستِ خود در حالتِ ثباتِ حواس، بے جبر و اکراہ برضاے خود نوشتہ ام، دست آویزِ کامل شناسند"۔

یہ مرزا صاحب کے قلم کا لکھا ہوا دستاویزی خط ہے جو خدادادخاں، ولی دادخاں کے نام لکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے اِس کا عکس علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ وہاں اِس کا عکس بہت ہلکا ہے، اچھی طرح خوانا نہیں۔ دوبارہ یہ آج کل (نئی دہلی) کے غالب نمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا بہتر طور پر۔ میں نے اِسی کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ تیسری بار یہ مالک رام کی کتاب فسانۂ غالب میں شائع ہوا ہے۔ اِس دستاویزی خط سے متعلق تفصیلات کو اِس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مالک رام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے: "غالب کا اصلی خط علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ حبیب گنج میں[2] محفوظ ہے" (فسانۂ غالب، ص ۳۳)۔ اِس خط کے

۱۔ اِسے خلافِ معمول یوں لکھا گیا ہے کہ اُردو، فارسی میں بیش تر اِسے بروزنِ فعول نظم کیا گیا ہے، مثلاً:

مگر شعلہ بود ستِ نے راخوراک — کہ خیز دفغاں ازلبش دردناک (ملّا طغرا: بہارِ عجم)

مولفِ نوراللغات نے خوراک کو "بروزنِ بُراق" لکھ کر، مزید لکھا ہے: "بحر نے "خوٗراک" کہا ہے، لیکن اب فصحا کی زبان پر بروزنِ بُراق ہی ہے۔ بحر: رزق سے محروم رازق نے نہ رکھا، شکر ہے= گوشت پر اپنے گرے، ٹوٹے جو ہم خوٗراک سے"۔ جانصاحب نے "خوٗراکی" لکھا ہے: دیتا خوٗراکی ہے، رزّاق ہے مودی میرا= خرچ اِس بندی کا کیا اوہی، ہے اُن پر چلتا (ایضاً)۔

۲۔ یہی صحیح طریقہ ہے حوالہ دینے کا۔ اِس بات کو لازم قرار دیا جانا چاہیے کہ جب بھی کسی خطّی تحریر کا حوالہ دیا جائے (وہ کسی کی تحریر ہو) لازماً یہ بتایا جانا چاہیے کہ اب وہ کہاں ہے۔ اگر یہ بات نہ معلوم ہو، اُس صورت میں اِس کی وضاحت کی جانا چاہیے کہ یہ تحریر اب دست یاب نہیں اور اِس صورت میں حوالہ دینے والے کو لازماً یہ بتانا ہوگا کہ اُس نے اُس کو کہاں دیکھا تھا، کس طرح وہ اُس تک پہنچی تھی۔ اِس کے بغیر حوالوں کو مشتبہ مانا جانا چاہیے۔ خطّی تحریروں کے سلسلے میں چوری چکاری کی وارداتیں بڑھ گئی ہیں، یوں بھی اِس طرح کی پابندیاں لگایا جانا ضروری ہے۔ یہ لازم ہے کہ عکس اگر اُس سے پہلے شائع ہو چکا ہے اور اب دوبارہ اُس کو شائع کیا جا رہا ہے، تو واضح....

حصول کی ضروری تفصیل ڈاکٹر مختار الدّین احمد نے علی گڑھ میگزین میں بھی لکھی ہے۔

اُردو میں اب عموماً ''دستاویز'' لکھتے ہیں، مرزا صاحب کی اِس تحریر میں (اور دوسری تحریروں میں اگر کہیں یہ لفظ آیا ہو) لازماً ''دست آویز'' لکھا جائے گا، فارسی میں بھی اور اُردو میں ابھی۔

دُکان (دوکان): نوّاب کلبِ علی خاں کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

''یہ ذلیل کو عزّت دینی اور دُکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے(عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۵۱)۔ ''در بریلی متصل مکان قاضی صاحب بر دکانِ لالہ ٹیکارام'' [غالب کے بھیجے ہوئے ایک لفافے کا عکس، مشمولہ مقالہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی: ''غالب کے خطوں کے لفافے''۔ رسالہ ہندستانی (الہ آباد) اپریل ۱۹۳۴ء]۔

عرشی صاحب نے مقدّمۂ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے کہ نوّاب یوسف علی خاں ناظم کے ایک شعر میں کاتب نے ''دوکان'' لکھ دیا تھا، مرزا صاحب نے اصلاح دیتے ہوئے واو کو قلم زد کر دیا (ص ۲۲۱)۔ اِس اصلاح سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''دکان'' میں واو لکھنے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ نیز اُن کی دستی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ''دکان'' لکھتے تھے۔

....لفظوں میں یہ بتایا جانا چاہیے کہ یہ اُسی شائع شدہ عکس کی تکرار ہے، یا یہ کہ اصل تحریر حوالہ دینے والے کی ملکیت ہے اور اب اُس اصل سے یہ عکس شائع کیا جا رہا ہے۔ اِس پر تو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اُس اصل تحریر کا ذریعۂ حصول بھی بتایا جائے، مگر یہ ضرور لازم ہوگا کہ صاف لفظوں میں یہ لکھا جائے کہ اب وہ میرے پاس ہے۔

۱۔ اصلاً ''دست آویز'' ہے، ''دستاویز'' بعد کی شکل ہے۔ برق لکھنوی کا شعر ہے:

دست آویز یہ موجود ہے دل لینے کو چور، سب جانتے ہیں، وزدِ حنا ہوتا ہے (اُردو لغت)

فرہنگِ فارسی میں ''دستاویز'' ہے، لیکن اُس کے تحت لکھا گیا ہے: دیکھیے دست آویز، معلوم ہوا کہ اصل صورت ''دست آویز'' ہے۔ مولفِ برہانِ قاطع نے لکھا ہے:

''دست آویز، بروزنِ رستاخیز، آنچہ ہمراہ آورند و آنرا وسیلۂ مدّعاے خود سازند۔ و بہ معنی در آویختن و دست در چیزے زدن و آنرا پشت و پناہ خود ساختن و تکیہ برآں کردن ہم آمدہ است''۔

اِس کے حاشیے میں اِس لغت کے مرتب اور معروف زبان شناس ڈاکٹر معین نے یہ اضافہ کیا ہے: ''کسیکہ در غرقابِ ہالک و گردابِ قاتل افتادہ.... بہر وجہ کہ ممکن گردد، دست آویزے میجوید''۔ مختصر یہ کہ اصلاً ''دست آویز'' ہے، جس طرح مرزا صاحب نے اس لفظ کو لکھا ہے۔ ''دستاویز'' اُسی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

اصلاً (یعنی عربی میں) ''دُکّان'' (معِ کافِ مشدّد) ہے۔ فارسی میں اِسے بہ تخفیف بھی استعمال کیا گیا ہے۔ فارسی لغات میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ ''دوکان'' صحیح املا نہیں:

''دکّان، بالضم وتشدید...وفارسیاں بہ تخفیف استعمال نمایند۔ و
تلفظ و کتابتِ آں بہ واو بعد الدال غلطِ فاحش، بلکہ
خطاست'' (بہارِ عجم)۔

دوسرے لفظوں میں اِس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اِسے اگر بروزنِ مفعول نظم کیا گیا ہو، تو اِس کو اشباع نہیں سمجھا جائے گا اور واو کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، یعنی اُس صورت میں نہ تو ''دوکان'' کہا جائے گا اور نہ لکھا جائے گا۔ چوں کہ اصلاً کاف مشدّد ہے، یوں وزن کی ضرورت سے اِسے اصل کے مطابق ''دُکان'' کہا جائے گا اور لکھا جائے گا۔

اِس لفظ کے سلسلے میں اِس وضاحت کی خاص کر یوں ضرورت پیدا ہوئی کہ عدمِ تعیّن کی وجہ سے، یا پھر کم توجہی کے نتیجے میں اِس لفظ کے املا میں یکسانیت نہیں ملتی۔ نسخۂ عرشی میں ص ۲۰ پر یہ شعر ہے، جس میں ''دوکان'' لکھا ہوا ہے:

شعلہ رو جب ہوگئے گرمِ تماشا، جل گیا خانمانِ عاشقاں دوکانِ آتشباز ہے

اِس کے برخلاف نسخۂ رضا گپتا میں اِس شعر میں ''دکان'' ہے (ص ۱۶۶)۔ مگر اسی نسخے میں ص ۳۴۰ پر ''دوکان'' ملتا ہے:

تاچند داغ بیٹھیے، نقصاں اُٹھائیے اب چارسوے عشق سے دوکاں اُٹھائیے

نسخۂ عرشی میں بھی ''دوکان'' ہے (ص ۳۷)۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اِن دونوں نسخوں میں ''دکان'' ہے:

سراسر عجز ہو، کرخانہ مانندِ کماں خالی دکانِ ناوکِ تاثیر ہے ازخود تہی ماندن

کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار جو ہے تجھے سرِ سوداے انتظار، تو آ

ایک شعر میں ''صاحب دکانی'' آیا ہے اور دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے، ع: چار سوے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے۔ ''وندانستند کہ کفۂ ترازو در کفِ ایں دُکانداران موہمی

زند'' (قاطع، ص ۷)۔ غرض کہ مخفف شکل میں تو سب نے ''دکان'' اور ''دکانی'' لکھا ہے، مگر جب یہ لفظ اصل شکل میں (بروزنِ مفعول) آیا ہے، تب اِس کے املا میں بے امتیازی نمایاں ہوئی ہے (دوکان۔دکّان)۔ یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ یہ لفظ جن شعروں میں بروزنِ مفعول نظم ہوا ہو، اُن اشعار میں اِسے اصل کے مطابق معِ کافِ مشدّد (دُکّان) لکھا جانا چاہیے، ''دوکان'' نہیں لکھنا چاہیے۔ اِس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ''دوکان'' میں واو اشباع کے لیے آئے گا۔ اِس لفظ میں واو کسی بھی صورت میں نہیں آئے گا۔

دلہوسی: نوّاب یوسف علی خاں ناظم کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے اپنے اعزازات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں لمبر اور سات پارچے اور جیغہ سرپیچ، مالاے مروارید خلعت مقرّر ہے۔ لارڈ ہاردنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ دلہوسی یہاں آئے نہیں'' (عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۱۸)۔

دِلّی، دہلی: مرزا صاحب کی تحریروں میں یہ دونوں لفظ ملتے ہیں۔ اُنھوں نے کہیں ''دِلّی'' لکھا ہے، کہیں ''دہلی''۔ مثلاً ایک خط کی آخری دو سطروں میں سے ایک میں ''دِلّی'' ہے اور دوسری سطر میں ''دہلی'': ''میں جادہ نوردِ ستم آبادِ دہلی ہوا..... حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دِلّی پہنچتا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں، عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۴۲)۔ اِس عبارت میں یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ اضافت کے ساتھ ''دہلی'' لکھا ہے اور بغیرِ اضافت ''دِلّی'' لکھا ہے اور لام پر تشدید بھی لگائی ہے۔ میں نے شمار تو نہیں کیا، مگر سب خطوں کو پڑھنے کے بعد ذہن میں یہ خیال ہے کہ ''دِلّی'' نسبتاً زیادہ لکھا ہے۔

دوچار: مرزا صاحب نے لکھا ہے:

> ''دوچار شدن: بہم رسیدن دو کس را، بہ اعتبارِ آں کہ دو چشم چوں بادو چشمِ دگر پیوست ہر آئینہ چار شد، دوچار شدن گویند۔ واِیں معنی وقتے حاصل آید کہ بعد از دال، واو نویسند تا تثنیہ پدید

آید" (فرہنگِ غالب، ص۱۱۸)۔

تیغِ تیز میں اسی بات کو انھوں نے یوں لکھا ہے:

"دوچار ہونا، بہ معنی مقابل ہونے کے جب درست ہوتا ہے کہ دال کے آگے واو بھی ہووے، تا کہ تثنیہ پیدا ہو اور دو آنکھوں کا چار ہونا ثابت ہو جائے" (قاطع، ص۲۹۰)۔

مرزا صاحب کا اصرار اِس پر ہے کہ اِسے "دُچار" لکھنا درست نہیں، "دوچار" لکھنا چاہیے اور یہ بات بالکل درست ہے۔ ہاں، تلفظ میں واو کی آواز نمایاں نہیں ہوتی اور مرزا صاحب نے بھی اِسی طرح نظم کیا ہے، صرف دو مثالیں:

عکسِ موجِ گل وسرشاریِ اندازِ حباب   نگہِ آئنہ کیفیتِ دل سے ہے دوچار
(نسخۂ عرشی، ص۴)

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
(نسخۂ عرشی، ص۱۶۰)

[البتہ گنتی کے طور پر "دوچار" میں واو کی آواز نمایاں رہتی ہے، جیسے:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے   تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں
(نسخۂ عرشی، ص۱۶۰)

پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لوں دوچار   یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
(نسخۂ عرشی، ص۲۴۲)

دولھا: مکتوب بہ نامِ میر بندہ علی میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: "میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہہ مہاراو راجہ بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا" (عکس: غالب کے خطوط، ص۸۰۶)۔

مرزا صاحب نے "دولہہ" لکھا ہے، اِسے "دولھا" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "دولَہ" بھی (لام مفتوح۔ ہ ساکن)۔ مرزا صاحب آخرِ لفظ میں ہاے ملفوظ اور ہاے مخلوط کے لکھنے

میں کسی ایک انداز کے پابند نہیں تھے۔ آخرِ لفظ میں واقع ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط کو اُنھوں نے دُہری ھ کے ساتھ بھی لکھا ہے (جیسے: کچھ، وجھ)۔ اِسی طرح جن لفظوں کے آخر میں الف آتا ہے، اُن میں سے بعض کو ھ کے ساتھ بھی لکھا ہے۔ یہ لفظ سہرے کے ایک شعر میں بھی آیا ہے، عرشی صاحب نے وہاں ''دولھا'' لکھا ہے:

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

(نسخۂ عرشی، ص ۲۸۷)

میری راے میں اِس لفظ کے اِسی املا کو مرجّح مان لینا چاہیے۔ (نسخۂ عرشی میں جو ''پسینہ'' ہے، اُس پر ''الف اور ہائے مختفی'' کے عنوان کے تحت گفتگو کی جائے گی)۔

دونوں: اِس لفظ کو اِس گوشوارے میں محض احتیاطاً شامل کیا گیا ہے، اِس وجہ سے کہ یہ لفظ آخری نون کے بغیر بھی لکھا جاتا رہا ہے اور اِس کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، مرزا صاحب نے اِسے ہر جگہ ''دونوں'' لکھا ہے۔ محض ضابطے کی مطابقت کی خاطر ایک حوالے پر اکتفا کرتا ہوں: ''یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہوجائیں گے'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب ناظم۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۱۹۸)۔

مرزا صاحب کا خط بہ نامِ خلیفہ احمد علی احمدؔ رام پوری مکاتیبِ غالب میں شامل ہے (ص ۱۱۵) اُس میں ایک جملہ ہے: ''ابوالفضل اور فیضی یہ دونوں کیسے فاضل تھے''۔ عرشی صاحب نے حصّۂ حواشی میں اِس خط کے اِس جملے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے: ''اصل میں نون ساقط ہے۔ چوں کہ مرزا صاحب نے ہمیشہ اِس لفظ کو دو نون کے ساتھ لکھا ہے، اِس لیے متن کے اندر نون کا اضافہ کردیا گیا ہے'' (ص ۲۰۳)۔ یعنی عرشی صاحب نے اِس ایک خط میں ''دونو'' کو سہوِ قلم مانا ہے، اِس بنا پر کہ مرزا صاحب نے اور ہر جگہ ''دونوں'' لکھا ہے (اور یہ صحیح طریقہ کار ہے)۔

دوم۔ (دویم): مرزا صاحب نے تفتہ کے نام خط میں لکھا ہے:

"دویم بروزنِ جویم غلط ہے۔ "دوم" ہے بغیرِ تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں تو "دُیَم" پڑھیں گے، اگرچہ لکھیں گے 'دویم'۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں "دومی" درست ہے، مگر نہ بہ حذفِ تحتانی مثلِ "زمی" بہ حذفِ نون، بلکہ بہ طریقِ قلبِ بعض "دویم" کا "دومی" ہو گیا (خطوطِ غالب، ص ۶۹)۔

مختصر یہ کہ صحیح لفظ "دُوم" اور "دومی" ہیں، "دویم" نہیں لکھنا چاہیے۔

دھبّا: "کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرامی کا دھبّا مجکو نہیں لگا" (مکتوب بہ نامِ حسین مرزا، عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۸ کے مقابل)۔

اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ عرشی صاحب نے بھی اسی طرح لکھا ہے:

خار: کانٹا، داغ: دھبّا، نغمہ: راگ　　　　سیم: چاندی، مس: ہے تانبا، بخت: بھاگ

(نسخۂ عرشی، ص ۲۷۱)

ڈھونڈھنا: اِس مصدر کے مشتقات میں مرزا صاحب نے ہر جگہ دوھ لکھی ہیں، مثلاً: "الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں" (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۳۸)۔ "ثنا و دعا کے واسطے تقریب ڈھونڈھتا ہوں" (ایضاً، ص ۲۵۷)۔ "اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈھتے پھریں" (مکتوب بہ نامِ تفتہ۔ عکس: خطوطِ غالب، ص ۶ کے مقابل)۔

ذ۔ ز

مرزا صاحب اِس کو مانتے تھے اور اِس پر اصرار کرتے تھے کہ فارسی میں ایسے دو حرف موجود نہیں جو متحد المخرج ہوں۔ اِسی بنا پر وہ کہتے تھے کہ فارسی میں زے ہے، ذال نہیں، یعنی فارسی الاصل لفظوں میں ذال موجود نہیں۔ اِسی بنا پر وہ گزشتن، گزاشتن، پزیرفتن کے مشتقات کو زے سے لکھنا صحیح سمجھتے تھے۔ صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"خواجہ نصیر الدّین طوسی آٹھ حرف کا زبانِ فارسی میں نہ آنا لکھتے ہیں اور ذالِ نقطہ دار کا ذکر نہیں کرتے۔ الاّ کوئی لُغتِ فارسی ایسا بتائیے کہ جس میں ذال آئی ہو۔ گزاشتن و گزشتن و پزیرفتن، سب زے سے ہیں"۔

"کاغذ" دالِ مہملہ سے ہے، اُس کا ذال سے لکھنا اور "کواغذ" کو اُس کی جمع قرار دینا تعریب ہے بہ تحقیق۔

"آور" اسمِ آتش بہ دالِ ابجد ہے، نہ بہ ذالِ ثخذ۔ کوئی حرفِ متحد المخرج فارسی میں نہیں، بلکہ قریب المخرج بھی نہیں۔ تے ہے، طوے نہیں؛ سین ہے، صاد نہیں؛ ہائے ہوّز ہے، حائے حطّی نہیں؛ یہاں تک کہ قاف نہیں، اِس راہ سے کہ غین متحد المخرج، بلکہ قریب المخرج ہے؛ زے کے ہوتے ذال کیوں کر ہوگی"؟ (ادبی خطوطِ غالب، ص ۲۵)۔

اِسی بات کو قاطعِ برہان میں اِن الفاظ میں لکھا ہے:

"در فارسی دو حرفِ متحد المخرج، بلکہ قریب المخرج نیز نیامدہ۔ سینِ سعفص ہست و ثائے ثخذ و صادِ مہملہ نیست۔ تائے قرشت ہست و طائے دستہ دار نیست۔ الف است و عین نیست۔ بلکہ غین ہست و قاف نیست۔ ہر آئینہ چوں زائے ہوّز است و ضادِ ضدّیت و ظائے تناظر نیست، ذالِ ذلّت چرا باشد؟ بودنِ دو حرفِ متحد المخرج چوں روا باشد۔ آرے، دبیرانِ پارس را قاعدہ چناں بود کہ بر سرِ دالِ ابجد نقطہ نہادندے، پسیناں ازیں رسم الخط بہ وجودِ ذالِ منقوطہ در گمان افتادند۔ چوں دریں اندیشہ وجودِ دالِ بے نقطہ از میاں میرفت و ہمہ ذالِ منقوطہ میماند، اکابرِ عرب قاعدۂ قرار دادند و تفرقۂ دال و ذال را بر آں قاعدہ اساس نہادند۔ و ایں کہ من میگویم، نہ گفتارِ

من است، بلکہ فرمانِ آموزگارِ من است، واں شت ہرمزد
پارسی نژادفرزانہ بود از تخمۂ ساسانیاں.... خود را عبد الصمد
نامیدہ'' (قاطع،ص ۱۵)۔

مرزا صاحب نے فارسی میں متحد المخرج حروف کے نہ ہونے کے متعلق جو کچھ لکھا اور جس کی بنیاد پر فارسی میں ذال کے وجود سے انکار کیا، مولوی احمد علی نے اُس پر اعتراض کیا۔ مرزا صاحب نے تیغ تیز میں اُس کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

''جو کچھ میاں جی نے لکھا ہے، خود بھی نہ سمجھے ہوں گے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میں نے اتحادِ مخرج موافقِ تلفظ کہا ہے، نہ موافقِ قراءت، کہ وہ خاص کلامِ مجید کی تلاوت کے واسطے موضوع ہے...''گنبد'' کو ''گنبذ'' بہ ذالِ نقطہ دار ہم نے لڑکوں اور فرومایہ لوگوں کے سوا کسی سے سُنا بھی نہیں جو اُس کی املا میں دخل دیں۔

ہاں ''کاغذ'' دراصل دالِ ابجد سے ہے، مگر خاص و عام کے تلفظ میں اور ہر کتاب میں عموماً ذالِ ثخذ سے ہے... اِس تلفظ اور اِس املا کے احاطے سے نکلا نہیں جاتا۔

خلاصہ میری تحقیق کا یہ ہے کہ پزیرفتن، گزاشتن، گزشتن، گزاردن اور اُن کے مجموع مشتقات، اور اسمائے شہور و ایّام مثلِ آزر و اسفندار مزد وغیرہ سب زائے ہوز سے ہیں۔ اور تدرو اور کاغذ اور گنبد، یہ تین لغت بھی بہ دالِ ابجد ہیں۔ ''تدرو'' کی دال پر نقطہ دینے والے لغو اور پوچ اور بے خبر ہیں۔ ''کاغذ'' کا نقطہ دینا اور پڑھنا ناچار قبول کرنا پڑا اور مرگِ انبوہ کو جشن سمجھنا پڑا'' (تیغ تیز، مشمولہ قاطعِ برہان و رسائلِ

متعلقہ، ص۲۸۴)۔

یہی بات اُنھوں نے پنج آہنگ میں لکھی ہے:

''گزشتن، گزشت، گزشتہ، گزرد، گزرندہ، گزر، گزاشتن، گزاشت، گزاشتہ، گزارد، گزارندہ، گزار؛ بہ اعتقادِ نامہ نگار نگاشتنِ ایں ہردو بحث بہ زاے ہوز رواست، و بہ ذال خطاست'' (پنج آہنگ، ص۱۰۸)

''پزیرفتن، پزیرفت، پزیرفتہ، پزیرد، پزیرندہ، پزیر؛ نوشتنِ ایں بہ ذال بہ دانستِ نامہ نگار خطاست'' (پنج آہنگ، ص۱۰۴)۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ فارسی کے حروفِ تہجی میں ذال شامل نہیں؛ اِس بنا پر وہ یہ بھی مانتے تھے کہ فارسی کے مصدر گزشتن، گزاشتن، گزاردن، پزیرفتن؛ اِن سب میں زے ہے، اِس لیے اِن کے مشتقات میں ذال نہیں لکھنا چاہیے۔ نوّاب یوسف علی خاں ناظم کے ایک شعر میں ''سرگذشت'' لکھا ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے اصلاح دیتے ہوئے اُسے قلم زد کر دیا، اُس کی جگہ ''سرگزشت'' لکھ دیا (مقدمہ مکاتیبِ غالب، ص۲۲۳)۔

مرزا صاحب کی اِس راے سے اہلِ علم نے اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے تو یہاں تک لکھ دیا: ''میرزا غالب نے پہلے نادانی سے، پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے ذ کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی'' (مقدمہ مکاتیبِ غالب، ص۲۲۴)۔ فارسی میں گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن میں ذال لکھا جاتا ہے۔ ہاں گزاردن میں زے ہے۔ اِس کے باوجود، اُن کے کلامِ نظم و نثر میں، وہ اُردو ہو یا فارسی، اُن کے اِس نقطۂ نظر کی پابندی کی جانا چاہیے اور سارے فارسی لفظوں میں التزام کے ساتھ زے لکھنا چاہیے، مثلاً:

گزشتہ، گزشتگاں، گزراں، راہ گزر، راہ گزار، پزیرائی، پزیرا، پزیر، گزرگاہ (گزرگاہِ خیال)۔

عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں ایسے لفظوں کو مرزا صاحب کی وضاحت کے مطابق زے کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی صحیح طریقۂ کار ہے۔ ہم اپنی تحریر میں اِن لفظوں میں ذال لکھیں گے، مگر مرزا صاحب کے کلام میں اپنی پسند کو اور اپنے نقطۂ نظر کو ترجیح نہیں دیں گے، مرزا صاحب کے نقطۂ نظر کو اور اُن کی پسند کو لازماً ملحوظ رکھیں گے، جس طرح عرشی صاحب نے ملحوظ رکھا ہے۔ نسخۂ عرشی سے ایسی دو چار مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
(ص ۱۲۴)

موجہ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال　　ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
(ص ۱۶۳)

از خود گزشتگی میں خموشی پہ حرف ہے　　موجِ غبارِ سرمہ ہوئی ہے، صدا مجھے
(ص ۷۶)

جوں بوے گل ہوں گرچہ گراں بارِ مشتِ زر　　لیکن اسدؔ، بہ وقتِ گزشتن جریدہ ہوں
(ص ۶۱)

اصل بحث کے بعد ضمنی طور پر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''گنبذ'' (معِ ذال) کے متعلق اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ درست نہیں (زبان کی کرختداریت سے قطعِ نظر کرتا ہوں)۔ میر امّن کی باغ و بہار میں اور میر حسن کی سحر البیان میں ''گنبذ'' ملتا ہے (اِن دونوں کو راقم الحروف نے مرتب کیا ہے اور اِن میں شامل ضمیمہ تلفظ و املا میں اِس لفظ پر ضروری گفتگو کی گئی ہے)۔ چوں کہ اب عموماً ''گنبد'' (معِ دالِ مہملہ) لکھا جاتا ہے، اِس لیے اِس لفظ کے املا میں کچھ جھگڑا باقی نہیں رہا (گنبذ، عہدِ غالب سے پہلے کی تحریروں میں ملتا ہے)۔

''کاغذ'' کا املا ذال کے ساتھ خود اُنھوں نے قبول کرلیا تھا (مجبوراً سہی) اِس لیے اِس لفظ کے املا میں کچھ اختلاف نہیں رہا۔ ''کاغذ'' اور اِس کی جمع ''کواغذ'' اُن کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ محض احتیاطاً ''کواغذ'' کا ایک حوالہ درج کیا جاتا ہے: ''نوّاب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر

نے کلکتے سے میرے پنسن کے کواغذ طلب کیے اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہوکر..."۔ (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس مشمولہ مرقعِ غالب، ص ۲۰۶)۔

راجہ: اِس لفظ کو مرزا صاحب نے ہر جگہ اسی طرح (مع ہائے مختفی) لکھا ہے اور مع اضافت بھی لکھا ہے: مہادیو، بہ معنیِ دیوِ بزرگ و مہاراجہ، بہ معنیِ راجۂ بزرگ" (قاطع، ص ۱۶۸)۔ "نرندر سنگھ راجۂ پٹیالہ بے تکلف مرگیا" (مکتوب بہ نامِ مجروح۔ عکس: خطوطِ غالب، ص ۲۸۱ کے مقابل)۔

راو، مہاراو: "عبداللہ بیگ خاں الور میں راو راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا" (خود نوشت حالات۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۹۷)۔ "میرا باپ عبداللہ بیگ خاں.... مہاراو راجہ بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا" (مکتوب بہ نامِ میر بندہ علی خاں۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۸۰۶)۔ "جناب سری مہاراو راجہ بہادر نے جو میرے حق میں فرمایا" (ایضاً)۔

مرزا صاحب نے "راو" کے واو پر ہمزہ کہیں نہیں لکھا (صحیح املا بھی یہی ہے)۔ اِسی وزن کے ایک اور لفظ "گاو" کو بھی مرزا صاحب نے اِسی طرح ہمزہ کے بغیر لکھا ہے (دیکھیے: گاوزباں)۔ کلامِ غالب کے لیے اِن لفظوں کے اِسی املا کو اختیار کیا جانا چاہیے۔ نسخۂ عرشی میں ایک قصیدہ ہے، جس کا مطلع ہے:

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ (ص ۲۷۸)

یہ قصیدہ بہ قولِ عرشی صاحب: "راجہ شیودان سنگھ والیِ الور کی شان میں لکھا گیا ہے" (ص ۳۷۹)۔ اِس میں یہ شعر بھی ہے:

خود آسماں ہے مہاراو راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں اِس تار پر نثار گرہ

نسخۂ عرشی میں "مہاراؤ" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ املائے غالب کے خلاف ہے (اور یہ اِس لفظ کا صحیح املا بھی نہیں)۔ خود مرزا صاحب نے "راو راجہ بختاور سنگھ" لکھا ہے۔

راے: مرزا صاحب نے اِس لفظ کو ہر جگہ اِسی طرح لکھا ہے (یعنی ''رائے'' نہیں لکھا)۔ ''نہ حواس درست، نہ راے صحیح'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۵۵)۔ ''نہ فرہنگ لکھنے والوں کی راے کے بموجب'' (ایضاً ص ۲۶۸)۔ اور اُن کی راے سب کے پسند آئی (ایضاً، ص ۲۶۰)۔ ''ہم نے مطابقتِ راے کی ہے'' (مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۴۸ کے مقابل)۔

''راے'' میں ے جزوِ لفظ ہے اور مرزا صاحب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ جس لفظ میں ے مجزوِ لفظ ہو؛ اُس پر ہمزہ لکھنا، عقل کو گالی دینا ہے۔ [''ہاے'' کے تحت اِس خط کی متعلقہ عبارت نقل کی گئی ہے]۔ راے، ہاے، واے، براے، بجاے؛ یا راو، ناو جیسے لفظوں کے آخری حرف پر ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔

ہندی لفظ ''راے'' جو مثلاً موہن راے یا راے بہادر میں آتا ہے، اُس میں ے پر ہمزہ نہیں لکھا جانا چاہیے؛ مرزا صاحب نے بھی نہیں لکھا: ''نوندراے کو حرف بہ حرف خط پڑھا لایا ہوں'' (مکتوب بہ نامِ حسین مرزا۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۹۶ کے مقابل)

رایگاں: تفتہ کے نام خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''اِس مطلع کو یوں درست کردیا ہے: رایگانست زندگانی ہا=متیواں کرد جانفشانی ہا'' (عکس: خطوطِ غالب، ص ۶ کے مقابل)۔ ''رایگاں'' کا صحیح املا بھی یہی ہے (گاف سے پہلے ی)۔ ایسے جتنے لفظ ہیں، جیسے: شایگاں، ہمسایگاں، فرومایگاں، کم مایگاں، بے مایگاں، گراں مایگی، کم مایگی، ہمسایگی؛ یا جیسے: جایگاہ، پایگاہ؛ اُن سب کو کلامِ غالب میں فارسی اور اُردو دونوں میں اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ اِن میں ی پر، یا ی کے بجاے، ہمزہ لکھنا درست نہیں ہوگا۔ عرشی صاحب نے عموماً اِس کا لحاظ رکھا ہے۔ صرف دو مثالیں ایک اردو کی، ایک فارسی کی:

تب نازِ گرانمایگیِ اشک بجا ہے   جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے
(نسخۂ عرشی، ص ۲۳۴)

۱۔ مآثرِ غالب (مرتبہ قاضی عبدالودود) کا نیا اڈیشن ادارہ تحقیقاتِ اُردو (پٹنہ) کی طرف سے شائع ہوا ہے (۱۹۹۵ء)۔ اِس میں ص ۴ پر چار جگہ ''رائے'' چھپا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ شائع کرنے والوں کی بے پروائی یا لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ (اِس اشاعت میں ایسی غلط نگاریاں بہت ہیں)۔ یہ مجموعہ پہلی بار علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا، اور اُس میں ہر جگہ ''راے'' ہے۔

بہ پالش جاں فشاندن شرمسارم کرد، میدانم
کہ داند، ارزشے نبود متاعِ رایگانی را

(انتخابِ غالب، ص۶)

رپوٹ: مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے۔ ایک فارسی عرضی اور ایک اُردو خط سے دو، دو مثالیں:

''گورنمنٹ سے رپوٹ طلب ہوئی'' (مکتوب بہ نامِ نعیم الحق آزاد۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۷۲۵)۔ ''رپوٹ کی روانگی کی دیر ہے'' (ایضاً)۔ مرزا صاحب کی ایک عرضی کا عکس نامہ ہای فارسیِ غالب میں شامل ہے، اُس میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے: ''نقلِ آں رپوٹ''۔ ''رپوٹے کہ جناب جرنیل صاحب''۔

رتھ: مقدمہ مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب نے ''رتھ'' کو ''رت'' لکھا ہے (ص ۲۳۰)۔ مرزا صاحب نے یوسف علی خاں عزیز کے نام خط میں لکھا ہے:

''رت، لفظِ ہندی الاصل ''رتھ'' ہے بہ ہاے مضمرہ۔ بعض مذکر بولتے ہیں، بعض مونث''۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۱۳۱ کے مقابل)۔

اِس عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے ''رت'' لکھا تھا، مرزا صاحب نے یہ بتایا ہے کہ اصل لفظ ''رتہہ'' (رتھ) ہے۔ اِس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ خود مرزا صاحب ''رت'' لکھتے تھے اور اُسی کو صحیح سمجھتے تھے۔ اِس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی راے میں ''رت'' کو مع ہ (رتھ) لکھنا چاہیے تھا۔

رزیدنٹ، رزیدنٹی: ''رزیدنِ فدوی بخدمتِ صاحب رزیدنٹ شاہجہاں آباد، دو وجہ دارد'' (عرضیِ مرزا غالب (بہ خطِ غالب)۔ عکس: نامہ ہای فارسیِ غالب، مقابل ص ۱۱۶)۔

''کاغذے کہ مناطِ دعویِ فدوی برآنست، در دفتر خانۂ رزیدنٹیِ شاہجہاں آباد نیست'' (ایضاً)۔

یہ لفظ مرزا صاحب کی کسی اور دستی تحریر میں مجھے نہیں ملے۔ یہ رزیڈنٹ اور رزیڈنٹی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ انھیں بھی لارڈ، پنسن، دلہوسی (وغیرہ) کی طرح سمجھنا چاہیے اور مرزا صاحب کی تحریر میں اُن کے اختیار کردہ املا کی پابندی کی جانا چاہیے۔

روانہ: مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ''روانہ'' اور ''روانا'' دونوں املا ملتے ہیں۔ مرزا صاحب کی جس قدر دستی تحریروں کے عکس میرے سامنے ہیں، اُن میں میرے شمار کے مطابق ''روانا'' چھے جگہ ملتا ہے اور ''روانہ'' گیارہ جگہ۔ غالب کے خطوط کی چاروں جلدوں میں شامل عکسی تحریروں پر یہ جائزہ مبنی ہے، اِس تفصیل کے ساتھ: روانہ: ص ۱۲۶۳ (دو خطوں میں تین جگہ)، ۱۲۸۰، ۱۳۰۰، ۱۳۰۵، ۱۴۵۱، ۱۴۵۶، ۱۴۵۸، ۷۲۵، ۶۷۲۔۔ روانا: ص ۲۳۷، ۱۲۶۶، ۱۲۸۸، ۱۰۸۲، ۱۲۶۷ (دو بار)۔

اصل لفظ ''روانہ'' ہے، مرزا صاحب نے اِس طرح بھی لکھا ہے اور ''روانا'' کے مقابلے میں زیادہ لکھا ہے؛ اِن دو وجہوں کی بنا پر اُن کے کلام میں ''روانہ'' کو مرجح املا ماننا چاہیے۔

روپیہ، روپے: مرزا صاحب نے ہر جگہ ''روپیہ'' لکھا ہے، یہ قائم صورت ہے۔ محرف صورت میں ''روپیہ'' بھی لکھا اور ''روپیے'' بھی۔ مناسب یہ ہوگا کہ قائم صورت میں ''روپیہ'' ہی لکھا جائے۔ مثلاً: روپیہ آیا۔ محرف صورت میں ''روپے'' لکھا جائے: سو روپے، روپے وصول ہو گئے۔

رُؤَسا: مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''دلّی اب شہر نہیں، چھاونی ہے، کنپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے روسا'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۳۰)۔

عرشی صاحب نے مقدمہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے: ''لفظ 'مؤید' اور 'رُؤسا' کو بے ہمزہ کے موید اور روسا لکھا ہے'' (ص ۲۳۲)۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے کلامِ نظم و نثر میں اِن دونوں لفظوں کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔

روداد۔ رویداد: مرزا صاحب کے یہاں ''روداد'' اور ''رویداد'' دونوں صورتیں ملتی ہیں:

''از من و رویدادِ رنجوریِ من پرسیدہ اند'' (عکسِ مکتوب: نقوش، خطوط نمبر، جلدِ اوّل)۔

بو، کہ بہ حشو بشنوی قصّہ ماو مدّعی
تازہ ز رویدادِ شہر طرحِ فسانہ کردہ ایم
(انتخابِ غالب، ص۱۲۷)

صبح شد، خیز کہ رودادِ اثر بنمایم
چہرہ آغشتہ بخونابِ ۔ جگر بنمایم
(ایضاً ص۱۳۵)

زرا: ذال اور زے کی بحث اس سے پہلے آچکی ہے؛ یہ بات بھی اُسی سلسلے کی ہے کہ مرزا صاحب ''زرا'' زے کے ساتھ لکھتے تھے اور اِسی املا کو صحیح سمجھتے تھے۔ مکتوب بہ نامِ شیونرائن میں اُنھوں نے لکھا ہے: ''اور اچھا میرا میاں زرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو'' (عکس: خطوطِ غالب، ص۴۰۴)۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے:

> ''دیوانِ غالب کے خوش خط قلمی نسخے میں ایک جگہ کاتب نے ''ذرا'' کو ذال سے لکھا تھا؛ میرزا صاحب نے یہاں بھی ذال کا سرچاقو سے چھیل کر اُسے ''زرا'' بنادیا ہے'' (مکاتیبِ غالب، مقدّمہ، ص۲۲۵)۔

کلامِ غالب میں ''زرا'' ہی لکھا جانا چاہیے۔ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب نسخہ عرشی میں اِس کا لحاظ رکھا ہے، صرف دو مثالیں:

مُنھ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ زرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے (ص۲۳۵)

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے (ص ۲۴۰)

(ضمنی طور پر یہ لکھا جاتا ہے کہ عربی میں ''ذرّۃ'' تھا، جو فارسی میں ''ذرّہ'' بن گیا۔ اُردو میں اسی سے ''ذرا'' بنا ہے۔ چوں کہ یہ مہنّد صورت ہے، اِس لیے کچھ لوگوں کی یہ رائے رہی ہے کہ اِسے زے سے لکھا جائے۔ جلالؔ کی بھی یہی رائے تھی۔ مقصد یہ ہے کہ مرزا صاحب اِس لفظ میں زے لکھنے والوں میں تنہا نہیں تھے (اگر چہ اکثریت ''ذرا'' لکھتی رہی ہے) میں نے اُردو املا میں اِس لفظ سے متعلق ضروری باتوں کو یک جا کر دیا ہے (ص ۱۴۱-۱۴۴) مزید وضاحت کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے)۔

سارتی فکٹ: مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ہر جگہ اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے (تی۔ اور دونوں ٹکڑے منفصل: سارتی): اور بہ قلمِ وزراے شاہنشاہی سارتی فکٹ خشنودی کا پائے ہوئے'' (عکس: غالب کے خطوط، ص ۷۵۰)۔ ''دو سارتی فکٹ پا چکا ہوں'' (عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۱۴)۔

عرشی صاحب نے آخری خط (بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے: ''مرزا صاحب نے لفظِ ''سارٹیفکٹ'' میں پہلی ٹ کو ت تحریر کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ سارٹی فکٹوں سے مرزا صاحب کی مراد وہ دو خط ہیں جو قصیدے اور عرض داشت کی رسید اور اُن کی وفاداری کے اعتراف میں دو گورنر جرنلوں نے اُنھیں بھیجے تھے'' (حواشیِ مکاتیبِ غالب، ص ۱۲۸)۔ ''سبحان اللہ سارتی فکٹ لکھنے کا کس وقت میں اتفاق ہوا ہے'' (سند بہ نامِ زکی، عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۹۶)۔ مرزا صاحب نے اسی طرح نظم بھی کیا ہے:

توقّع آنکہ یکے سارتی فکٹ یابم   ز پیشگاہِ عنایاتِ والیِ والا

(سبد چیں، بہ حوالۂ مکاتیبِ غالب، حواشی، ص ۱۸۱)۔

سانون: اِس لفظ کو مرزا صاحب نے اِسی طرح (الف کے بعد نونِ غنّہ) لکھا ہے۔ نواب

کلبِ علی خاں کی خدمت میں جو قطعہ اُنھوں نے بھیجا تھا، اُس کے ایک شعر میں یہ لفظ آیا ہے:

جس طرح باغ میں سانون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم

(عکس: مرقعِ غالب، ص۱۸۱)

دہلوی لہجے میں انفیت بہت سے لفظوں میں راہ پا گئی ہے، لیکن بول چال کی حد تک؛ یہاں مرزا صاحب نے اِسے بول چال کے مطابق ہی لکھا ہے۔ (اُنھوں نے ایسے کئی لفظوں کو اِسی طرح (مع نونِ غنہ) لکھا ہے، جیسے: چانول، جس کا حوالہ آچکا ہے، اور ''سونچنا'' جس کا حوالہ آئے گا)۔ اِس لفظ کو اُن کی عبارت میں اِسی طرح (مع نونِ غنہ) لکھا جانا چاہیے۔

سپارش: مرزا صاحب کی تحریر میں یہی املا ملتا ہے۔ مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم، مرقومہ ۲۲ر جولائی ۱۸۶۱ء میں یہ لفظ تین بار آیا ہے: ''لازم کرلیا ہے کہ بیہودہ گزارش نہ کروں اور کبھی کسی کی سپارش نہ کروں'' (عکس: مرقعِ غالب، ص۲۰۲)۔ ''اس کو میں نے سپارش نہ سمجھا تھا'' (ایضاً)۔ ''درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف معرّف ہونا تھا'' (ایضاً)۔

فارسی میں سپارش اور سفارش، دونوں ہیں (غیاث اللغات، فرہنگِ فارسی)۔ سپردن اور سپاردن، دو مصدر ہیں (برہانِ قاطع، فرہنگِ فارسی) سپاردن سے ''سپارش'' حاصل مصدر بنے گا۔ ''سفارش'' اِسی کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق اصل فارسی لفظ ''سپارش'' کو ترجیح دی ہے۔

ستایش (ستائش): ایسے سارے حاصل مصدر، جن کے فعلِ مضارع میں آخری حرف دال سے پہلے یٰ ہے، مرزا صاحب کی تحریروں میں اِسی طرح ملتے ہیں، جیسے: افزایش، فرمایش۔ (''آرایش'' کے تحت اس کی تفصیل آچکی ہے)۔ اِن دونوں لفظوں میں بھی شٓ سے پہلے لازماً یٰ لکھی جائے گی، یعنی ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر
قاصر ہے، ستایش میں تری، میری عبارت
(نسخۂ عرشی، ص ۱۲۷)

سکرتر: ''کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں''۔ ''وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے''۔ ''وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم۔ مرقومہ ۷/نومبر ۱۸۵۹ء۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۸)۔ مرزا صاحب نے ہر جگہ اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا ہے۔ (یہ وہی لفظ ہے جسے ہم ''سکریٹری'' لکھتے ہیں۔ ''سکتر'' بھی اِسی کی بدلی ہوئی صورت ہے)۔

سنبھل: ''حضرت کا سنبھل تک بہ سبیلِ ڈاک تشریف لے جانا'' (بہ نامِ نوّاب کلب علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۵۶)۔

سَونپنا: اِس مصدر کو اِس گوشوارے میں محض اِس لیے شامل کیا گیا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مرزا صاحب نے اِس کے مشتقات کو اِسی طرح لکھا ہے (یعنی معِ نونِ غنہ، جس طرح بہ طورِ عمومِ اسے لکھا جاتا ہے)۔ احتیاطاً ایک مثال: ''دو جگہ اپنی مُہر کی اور وہ تھلیا کہار کو سونپی'' (مکتوب بہ نامِ ناظم، مرقومہ ۲۶/دسمبر ۱۸۶۴ء۔ عکس: مرقعِ غالب[1]، ص ۲۳۰)۔

سُونچنا: اِس مصدر کے مشتقات کو مرزا صاحب نے ہر جگہ معِ نونِ غنہ لکھا ہے، مثلاً: ''یہ سونچ کر کہ آج کے آٹھویں دن جواب آئے گا''۔ (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۳۹)۔ ''بعد ادائے مراسمِ تسلیم سونچتا ہوں کہ کیا لکھوں'' (ایضاً، ص ۲۵۲)۔ ''منزل بہ منزل جانے میں سونچا'' (ایضاً، ص ۲۵۲)۔ ''میں سونچا کہ کاشی ناتھ دیکھے گا'' (مکتوب بہ نامِ حسین مرزا۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۹۶ کے مقابل)۔ عرشی صاحب نے اِسے مرزا صاحب کے

۱۔ فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا = فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
(نسخۂ عرشی، ص ۱۶۸) وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے = تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
(ایضاً، ص ۲۳۲)۔

اغلاط میں شمار کیا ہے۔ ''املا کی غلطیاں'' کے عنوان کے تحت اُنھوں نے لکھا ہے:

> ''مرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے...اردو کا لفظ ''سوچنا'' ہے؛ اُس کے مشتق ''سوچ'' کو اُنھوں نے ''سونچ'' اور ''سونچنا'' لکھ دیا ہے'' (مقدمہ مکاتیبِ غالب، ص۲۳۲)۔

اِسی خیال کے تحت اُنھوں نے نسخۂ عرشی میں ایسے لفظوں کو نونِ غنہ کے بغیر لکھا ہے۔ صرف دو مثالیں:

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا
(ص۱۵۱)

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں، وہ بھی
(ص۴۷)

نہ وہ قول درست تھا، نہ یہ عمل صحیح ہے۔ مرزا صاحب نے غلطی سے اِس مصدر کے مشتقات کو مع نون نہیں لکھا، وہ اِسی طرح صحیح سمجھتے تھے۔ اُن کی خطی تحریروں میں بار بار اِس مصدر کے مشتقات کا مع نونِ غنہ لکھا ہونا، اِسی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر صرف ایک جگہ ہوتا، تب سہوِ قلم کی بات سوچی جاسکتی تھی۔ چوں کہ آج کل بہ طورِ عموم ''سوچنا'' مستعمل ہے، اِس لیے یہ فرض کرلیا گیا کہ ہر زمانے میں یہ اِسی طرح مستعمل رہا ہوگا۔ یہ مصدر مع نونِ غنہ اور بغیرِ نونِ غنہ، دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں صرف ''سوچنا'' ہے؛ لیکن جلالؔ نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں اسے مع نونِ غنہ لکھا ہے۔ یہی نہیں، اُنھوں نے بغیرِ نونِ غنہ (سوچنا) کو غلط بتایا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

> ''سونچنا، نونِ غنہ کے ساتھ، اندیشیدن کا ترجمہ ہے۔ لوگ جو اِس کو بدون نونِ غنہ کے پڑھتے ہیں، یا لکھتے ہیں، مولف کے نزدیک غلط ہے''۔

بحرؔ لکھنوی نے اپنے رسالۂ لغات المصادر بحر البیان[1] میں اِسے صرف مع نونِ غنّہ لکھا ہے:

''سونچنا، واو مجہول و نونِ غنّہ، خیال کردن و بہ یاد آوردن چیزے را''۔

شوقؔ نیموی نے رسالۂ اصلاح میں لکھا ہے:

''سونچ کو متقدّمین نون سے لکھا کرتے تھے۔ ایک آدھ جگہ چونچ کے قافیے میں بھی نظر سے گزرا ہے؛ مگر اب فی زمانا اکثر ''سوچ'' بغیرِ نون لکھتے ہیں''۔

مختصر یہ کہ ''سونچنا'' (مع نونِ غنّہ) بھی مستعمل رہا ہے، مرزا صاحب بھی اِسی طرح لکھتے تھے، اِس بنا پر کلامِ غالب میں اِس مصدر کے سب مشتقات کو مع نونِ غنّہ لکھنا چاہیے۔

سُہرٹ: مرزا صاحب کی تحریروں کے جو عکس پیشِ نظر ہیں، اُن میں یہ لفظ صرف ایک خط میں ملتا ہے۔ تفتہ کے نام خط میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''لیا مے چند'' میں جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے.... مگر ہاں ''آمال ہا'' یہ کھلی ہوئی سہرٹ ہے'' (عکس: خطوطِ غالب، ص ۷ کے مقابل)۔

اصل لفظ ''سورٹھ'' ہے (فرہنگِ آصفیہ)۔ یہ لفظ اِسی ایک خط میں ملتا ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سہوِ قلم ہے، یا وہ اِس لفظ کو اِسی طرح بولتے تھے اور اِسی طرح صحیح سمجھتے تھے۔ دونوں باتیں بہ خوبی ممکن ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے اِسے ھ اور ہ کے قلب مع اِبدال کی مثال مانا ہے (مقدمہ خطوطِ غالب، ص ص ی)۔ چوں کہ یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، اور اِس کا امکان ہے کہ مرزا صاحب اِس لفظ کو اِسی طرح صحیح سمجھتے ہوں؛ اِس امکان کے پیشِ نظر مناسب یہی ہوگا کہ اِس لفظ کا یہی املا برقرار رکھا جائے۔

۱۔ اِس کا خطّی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ اِس کے مکمّل متن کو ضروری حواشی کے ساتھ میں نے اپنی کتاب زبان اور قواعد کے آخر میں شامل کر دیا ہے (اشاعتِ ثانی ۱۹۸۳ء، نئی دہلی)۔

سینکڑوں: یہ لفظ کسی عکسی تحریر میں مجھے نہیں ملا، جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جاسکتا کہ کلامِ غالب میں مرجّح صورت ''سیکڑا'' ہے یا ''سینکڑا''۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ دونوں شکلیں ہیں، مگر مولف کے اندازِ اندراج سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ''سیکڑا'' اور ''سیکڑوں'' بغیرِ نون مرجّح شکلیں ہیں۔ اِس سے قطعِ نظر، ایسی کوئی دلیل یا ایسا کوئی حوالہ موجود نہیں جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ کلامِ غالب میں اِسے کس طرح لکھا جانا چاہیے۔

عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں ہر جگہ اِسے مع نونِ غنہ لکھا ہے، مثلاً:

ضد کی ہے کہ اور بات، مگر خو بُری نہیں — بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے (ص۲۴۳)

خود آسماں ہے مہاراجہ راو پر صدقے — کرے گا سینکڑوں اِس تار پر نثار گرہ (ص۲۷۸)

ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا (۲۷۸)

یہ جتنے سینکڑے ہیں، سب ہزار ہو جاویں — دراز اُس کی ہو عمر اِس قدر، سخن کوتاہ (۲۷۸)

عرشی صاحب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اِس لفظ کے اِس املا کو کس بنا پر ترجیح دی گئی۔ اِس لفظ کے املا کے سلسلے میں میرے سامنے کوئی حوالہ تو نہیں، ہاں ایک قرینہ ضرور ہے۔ نسخۂ لاہور کی کتابت بہ قولِ عرشی صاحب نوّاب فخرالدّین محمد خاں نے کی ہے ''جو مرزا صاحب کے مشہور اور پسندیدہ کاتب تھے''۔ اِس خطّی نسخے کا عکس میرے سامنے ہے اِس کو شروع سے آخر تک پڑھنے پر معلوم ہوا کہ فخرالدّین محمد خاں نے اکثر و بیش تر مرزا صاحب کے طریقِ کتابت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اِس نسخے میں منقولہ بالا چار شعروں میں سے شروع کے دو شعر موجود ہیں اور اُن دونوں شعروں میں ''سینکڑوں'' اور ''سینکڑے'' دونوں لفظ مع نون لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دلیل تو نہیں، مگر یہ ایک قرینہ ضرور ہے اِس کا کہ مرزا صاحب اِن لفظوں کو اِسی طرح لکھتے تھے۔ کسی حوالے کی عدم موجودگی میں اِس قرینے کو اِن لفظوں کے املا کے تعیّن کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلامِ غالب میں اِن لفظوں کو مع نونِ غنہ ہی لکھنا چاہیے۔

شایستہ: ''بات یہ ہے کہ جو میں شایستہ مدح نہیں، تو یہ ستایش راجع آپ کی طرف

ہوگی، (مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۵۰۴)۔

"در پر امیر کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم   شایستہ گدائی ہر در نہیں ہوں میں"

(عکس: مرقعِ غالب، ص ۷۶)۔

(مصدر شایستن ہے، اُس سے شایستہ، شایستگی، شاید، شایاں بنتے ہیں۔ اِن سب میں ی ہے؛ اُس کی جگہ ہمزہ لکھنا، یعنی شائستہ یا شائستگی یا شائد لکھنا درست نہیں ہوگا)۔

شُبْہہ: "آپ بے شبہہ رونقِ مسندِ علم و یقین ہیں" (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۳۷)۔ "بے شبہہ وہ الفاظِ پارسی ہوں گے" (مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔ ۱۹۴۸ء، ص ۴۸ کے مقابل)۔

اصلاً بھی اِس لفظ میں دو ہ ہیں: ایک ملفوظ اور ایک مختفی۔ جبہہ اور شبہہ، ایک ہی وزن کے لفظ ہیں۔ اِس لفظ کو گوشوارے میں اِس لیے شامل کیا گیا کہ اب بول چال میں عموماً "شبہ" بمعنے میں آتا ہے اور بہت سے لوگ لکھنے بھی لگے ہیں؛ مگر مرزا صاحب نے اِس لفظ کو اصل کے مطابق ہی لکھا ہے۔

ششن جج: "وہ وکیل ہیں؛ محکمۂ منصفی میں نہ رہیں گے، محکمۂ صدر امین و ششن جج میں کام کریں گے" (مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۴)۔

شکافتن، شکاف: "شکافتن مصدریست جداگانہ، ترجمہ آں: چیرنا۔ ماضی: شکافت و مضارع: شکافد و مفعول: شکافتہ" (قاطع، ص ۱۱۱)۔

فرہنگِ فارسی میں بھی "شکافتن" ہے۔ اردو میں عام طور پر "شگاف" کہتے ہیں اور لکھتے ہیں اور مصدر کو "شگافتن" سمجھتے ہیں۔ مرزا صاحب کی فارسی نظم و نثر میں لازماً "شکافتن" کو اصل مانا جائے گا اور اِس کے جملہ مشتقات کو معِ کاف لکھا جائے گا۔ اُردو تحریروں میں بھی اصولاً اِسی کی مطابقت اختیار کی جانا چاہیے۔

شوربا: "شوربا پاچہ گوسفند مائدۂ خاص پر موجود رہے" (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی

خاں۔ عکس: مرقعِ غالب ص ۲۴۰)۔ اِس لفظ کو اِس گوشوارے میں اِس خیال سے شامل کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ لاعلمی کی وجہ سے ''شوربہ'' لکھتے ہیں۔ (اِسی طرح سقہ، پخہ، تمغہ، معمہ، ناشتہ، حلوہ؛ حالاں کہ اِن سب لفظوں کے آخر میں الف ہے۔ اِن کا صحیح املا سقا، پخا، تمغا، معما، ناشتا، حلوا ہے۔ شوربا بھی اِسی فہرست میں شامل ہے)۔

طمانیت: ''رہی مزاجِ مبارک کی حقیقت، اُس سے بھی فی الجملہ طمانیت حاصل ہوگئی'' (مکتوب بہ نام نوّاب کلبِ علی خاں، عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۶۴)۔ اِس لفظ کو اِس فہرست میں محض احتیاطاً شامل کیا گیا ہے۔ وجہِ احتیاط یہ ہے کہ اصل (عربی کا) لفظ ''طمانینت'' ہے اور بعض صحّت پسند حضرات کا اصرار رہا ہے کہ اُردو میں بھی اِسی کو استعمال کیا جائے۔ ''طمانیت'' کو، جو اُردو میں بہ طورِ عموم مستعمل ہے، غلط اور قابلِ ترک کہا ہے (مثلاً مولفینِ قاموس الاغلاط اور مولفِ فرہنگِ آصفیہ)۔ مرزا صاحب نے اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق ''طمانیت'' لکھا ہے۔ یہ وضاحت اِسی لیے کی گئی ہے کہ کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہو۔

عَمَر: مرزا صاحب نے اِس لفظ کو (جو طلسمِ ہوش ربا کے ایک معروف کردار کا نام ہے) بہ فتحِ اوّل و دوم نظم کیا ہے اور عرشی صاحب کے ایک حاشیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اِسے لکھا بھی تھا اِسی طرح، یعنی آخری واو کے بغیر (حواشیِ مکاتیبِ غالب، ص ۱۵۵)۔ مولفِ فرہنگِ آصفیہ نے لکھا ہے:

> ''چوں کہ حضرت عمرؓ کے نام اور اِس نام میں بہ حالتِ تحریر فرق و امتیاز نہیں رہتا تھا... لہٰذا ایک زائد واو کے ساتھ اس کے لکھنے کی رسم ڈالی گئی''۔

اِسی لیے طلسمِ ہوش ربا کے معروف عیّار کا نام ''عمرو'' لکھا جاتا ہے، جو بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم (عَمْرو) ہے۔ اِس میں واو شاملِ تلفظ نہیں، محض ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقصد یہی تھا ''عُمَر'' اور ''عَمْر'' میں تحریری سطح پر بھی فرق نمایاں رہے۔ اِس میں میم پر جزم ہے، لیکن مرزا صاحب نے اِسے بہ فتحِ دوم نظم کیا ہے اور آخر کا زائد علامتی واو بھی نہیں لکھا۔ یعنی

تلفظ اور متعارف املا، دونوں میں تصرف ہوا۔ مرزا صاحب کے کئی شعروں میں یہ لفظ آیا ہے:

دُرِ معنی سے مرا صفحہ: لقا کی داڑھی

غمِ گیتی سے مرا سینہ: عَمَر کی زنبیل (نسخہ عرشی، ص ۱۶۴)

ایک فارسی قصیدے میں، جو نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے، یہ لفظ پانچ شعروں میں آیا ہے:

ز غمزۂ تو چہ گویم، کہ آں بود ز عَمَر دلیر و چست و ہنرمند تر بہ عیّاری

بہ پیشِ چرخِ مشعبد چہ ہوشیار و چہ مست کہ ایں بہ عربدہ ہمچوں عَمَر بہ طرّاری

رسیدہ بُخل بہ فکرِ من از عَمَر میراث کہ ہیچ گہ ندہد در سخن مرا یاری

دروغ گفتہ ام، آں فکر نیز زنبیل است کہ گم شود ز عَمَر دردمِ گرفتاری

دل است غمزہ ولب در فسونگری عَمَر است بدا کسیکہ ز دل نبودش مددگاری

یہ قصیدہ مکاتیبِ غالب میں متعلقہ خط کے ساتھ منقول ہے (ص ۴۲)۔ عرشی صاحب نے حصۂ حواشی میں "عَمَر" کے متعلق لکھا ہے:

"میرزا صاحب نے اِس نام کا املا اور تلفظ، دونوں غلط[1] لکھے ہیں...." (ص ۱۵۵)۔

غلتیدن: مرزا صاحب نے پنج آہنگ میں لکھا ہے کہ اِس مصدر کو اور اِس کے مشتقات کو بھی ط

۱۔ اُستادِ معظم نے "عُمَر" کو غلط بتایا ہے۔ اگر اصل پر نظر رکھی جائے، تب تو یہی کہا جائے گا، اصلاً تو بہ سکونِ دوم ہے، مگر ایک بات یہ بھی ہے کہ اِسے بہ فتحِ دوم نظم کیا گیا ہے۔ انشا کی وہ غزل جس کے قوافی سحر، بھر وغیرہ ہیں، اُس غزل میں یہ شعر بھی ہے:

ایک کوڑی کو نہ لیجے، جو فروشندہ کہے = ہے بکاؤ، کوئی زنبیلِ عَمَرو لیتا ہے (کلامِ انشا، ص ۲۶۲)۔

انشا ہی کا شعر ہے: زنبیل ہے عَمَرو کی دلِ فکر خیز یہ = اِس کو کسی طرح سے نہ زنہار توڑیے (ایضاً، ص ۳۳)۔

یہ ویسا ہی تصرف ہے جیسے مومن نے "شِمْر" کو "شِمَر" نظم کیا ہے:

دل ایسے شخص کو مومن نے دے دیا کہ وہ ہے = محب حسین کا اور دل رکھے شِمَر کا سا

مرتبِ دیوانِ مومن مولانا ضیا احمد بدایونی نے اِس پر یہ حاشیہ لکھا ہے: "شمر اصل میں بہ سکونِ میم ہے۔ بہ حرکت مومن کا تصرف ہے" (دیوانِ مومن، مرتبہ مولانا ضیا احمد بدایونی، ص ۴)۔

سے نہیں لکھنا چاہیے:

''غلتیدن، غلتید، غلتیدہ، غلتد، غلتندہ، غلت۔ آشکارا باد کہ نوشتنِ ایں بہ طائے حطّی غلط است۔ بلکہ چوں ایں را بہ طائے حطّی نویسند، خود بہ صورتِ غلطیدن میشود بہ معنیِ غلط کردن''۔(۱۰۷)

نسخہ عرشی کے اِس شعر میں ''غلطانی'' چھپا ہوا ہے:

حیرت ہجوم بلذتِ غلطانیِ تپش
سیماب بالش وکمرِ دل ہے آئنہ (ص۷۰)

مرزا صاحب کے منقولہ بالا قول کی روشنی میں ''غلتانیِ تپش'' ہونا چاہیے تھا۔ ہاں مندرجہ ذیل شعر میں ''غلتیدہ'' بالکل صحیح ہے:

پےِ نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بہ خوں غلتیدۂ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا
(نسخہ عرشی، ص۱۴۶)

اِسی طرح اِن اشعار میں بھی:

پرسد سببِ بیخودی از مہرومن از بیم
در عذر بخوں غلتم و گفتار ندانم
(انتخابِ غالب، ص۱۴۲)

غلتانیِ اشکم بود از حسرتِ دیدار
آیست نگاہم کہ بہ پیچد بہ گہر بر
(انتخابِ غالب، ص۱۰۲)

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بہ خوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا
(نسخہ عرشی، ص۱۴۳)

نسخۂ عرشی کے اِن اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلے شعر میں ''غلطانیِ تپش'' بے خیالی میں باقی رہ گیا۔ نسخۂ عرشی کی طبعِ ثانی میں بھی یہاں ''غلطانی'' ہے (ص ۷۵)۔ اِس سے یہی خیال کیا جانا چاہیے کہ یہاں نظر چوک گئی (اور یہ بہ خوبی ممکن ہے۔ ہم سب اِس صورتِ حال سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، بہ قولِ سعدیؔ: گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم)۔

کایتھ: ''مدّعا برآری، کایتھوں کا لفظ ہے۔ میں اِس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں'' (مکتوب بہ نامِ جنونؔ بریلوی۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۵۱۲)۔

کایتھ اور کایستھ، دونوں لفظ مستعمل رہے ہیں۔ پُرانی مثل ہے: کایتھ کا بیٹا پڑھا بھلا یا مرا بھلا (فرہنگِ آصفیہ)۔ مرزا صاحب نے ''کایتھ'' لکھا ہے، اِس بنا پر اُن کی تحریر میں اِسی کی مطابقت ملحوظ رکھی جائے گی۔

کمّل: ''مرادآباد کی سرا میں بھوکا پیاسا، کمّل اُوڑھ کر پڑ رہا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۴۲)۔ ''گوجروں نے اُسے لوٹ لیا۔ روپیہ، کمّل سب لے لیا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظمؔ۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۳)۔

کنپ: ''دلّی اب شہر نہیں؛ چھاونی ہے، کنپ ہے'' (ایضاً، ص ۲۳۰)۔

کنپنی: ''فدوی از متوسّلانِ سرکارِ جہاںمدار کنپنی انگریز بہادر دام اقبالہ و نمکخواران و پرورش یافتگانِ ایں دولتِ ابدمدّت است'' [عرضیِ مرزا غالبؔ (بہ خطِ غالبؔ) عکس مشمولہ نامہ ہای فارسیِ غالب، مقابل ص ۱۱۶]۔

کنپ اور کنپنی، اِن دونوں لفظوں کو مرزا صاحب نے عربی فارسی الفاظ کے طریقِ کتابت کے مطابق معِ نون لکھا ہے اور یہ کچھ نئی بات نہیں۔ اُس زمانے میں (اور اُس کے کچھ بعد تک) یہ اندازِ کتابت مروّج رہا ہے، جیسے: چنپا (چمپا) تنباکو (تمباکو) وغیرہ۔ مرزا صاحب کی تحریر میں اُن کے اختیار کردہ املا کی پابندی کی جانا چاہیے۔

کھچنا، کھینچنا: عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب میں مرزا صاحب کی بہت سی اصلاحیں بھی شامل کی ہیں۔ سب سے زیادہ اصلاحیں صاحب زادہ عباس علی خاں بیتاب رام پوری کے کلام پر ہیں۔ بیتاب کے ایک مصرعے پر اصلاح دیتے ہوئے مرزا صاحب نے ''کھچ'' لکھا ہے۔ بیتاب کا مصرع تھا: ''کھینچتا اور بھی کھنچ سکتیں گر ایسی اَشکال''۔ مرزا صاحب نے ''کھینچتا'' کو برقرار رکھا اور ''کھنچ سکتیں'' میں ''کھنچ'' کو قلم زد کر کے ''کھچ'' لکھ دیا۔ اِس سے بہ ظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ مصدرِ متعدی کو مع نونِ غنہ (کھینچنا) اور مصدرِ لازم کو ''کھچنا'' لکھتے تھے۔

اِس کی تائید کا ایک قرینہ بھی موجود ہے (دلیل نہیں۔ قرینہ) نسخۂ لاہور میں، جس کا کاتب عموماً مرزا صاحب کے طریقِ کتابت کو ملحوظ رکھتا ہے، مصدرِ لازم کے مشتقات بغیرِ نونِ غنہ مرقوم ہیں اور مصدرِ متعدی کے مشتقات مع نونِ غنہ، مثلاً:

خدایا، جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھچتا جائے ہے مجھ سے (ص ۹۳)
نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھچتا جائے ہے (ص ۷۰)

نسخۂ عرشی میں اِن دونوں شعروں میں ''کھینچتا'' اور ''کھنچتا'' (مع نونِ غنہ) ہیں۔ اِس نسخے میں ''کھچنا'' کے مشتقات عموماً مع نونِ غنہ ملتے ہیں، مثلاً: جب زلفِ یار کھنچ نہ سکے، شانہ کھنچیے (۱۰۵) جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے (ص ۲۲۷)۔

''کھینچنا'' میں تو املا کا کچھ اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو اُس کی لازم صورت ''کھچنا'' میں، کہ اِسے ''کھنچنا'' بھی لکھا گیا ہے۔ مثلاً فرہنگِ آصفیہ میں پہلے کھچا، کھچا جانا، کھچا رہنا، کھچاو، کھچ جانا، نونِ غنہ کے بغیر ہیں۔ اور پھر ''کھچنا'' اور ''کھنچنا'' دونوں مندرج ہیں۔

چوں کہ بیتاب کے شعر پر اصلاح کے ذیل میں مرزا صاحب نے مصدرِ لازم کے ایک مشتق ''کھچ'' کو بغیرِ نونِ غنہ اپنے قلم سے لکھا ہے (اور ضمنی طور پر یہ کہ نسخۂ لاہور میں بھی ''کھچنا'' کے مشتقات بغیرِ نونِ غنہ ہیں) اور یہ بھی کہ لغات (فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات) میں اِس

طرح بھی مندرج ہے؛ اِن وجوہ سے مرجّح صورت یہی ہوگی کہ مرزا صاحب کے کلام میں ''کھینچنا'' کے مشتقات کو مع نونِ غنّہ اور ''کھچنا'' کے مشتقات کو بغیر نونِ غنّہ لکھا جائے۔(یہ صورت بعض اور مصدروں کی بھی ہے کہ متعدّی صورت میں نونِ غنّہ شاملِ لفظ ہے اور لازم صورت میں اکثر بغیر نونِ غنّہ اور کم تر مع نونِ غنّہ لکھے جاتے ہیں، مثلاً: بانٹنا اور بٹنا۔اِس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے اردو املا کو دیکھا جاسکتا ہے، جس میں ایسے مصدروں کا مفصّل جائزہ پیش کیا گیا ہے، ص ۱۹۰ سے ص ۲۲۶ تک)۔

کَے: ''کَے'' بہ فتحِ کاف کے دو معنی ہیں: کب۔ ایران کے کیانی سلسلے کے بادشاہوں (جیسے: کیقباد، کیخسرو) کے لیے آتا ہے۔ دونوں معنوں میں کاف پر زبر ہے۔ اِس وزن کے سارے دو حرفی لفظ، جن کا پہلا حرف مفتوح ہے، اُن کے آخر میں ے لکھی جاتی ہے، جیسے: مَے، شَے، اَے، پَے؛ اِسی طرح ''کَے'' لکھا جائے گا۔

بہ ظاہر اِس (اور ایسے دوسرے الفاظ) کے املا میں کچھ اشکال نہیں؛ مگر اِن لفظوں کے املا میں دو رنگی نے نمود پیدا کر لی۔ جدید فارسی میں مجہول آواز نہیں، اِس لیے اب وہ لوگ تلفظ کے لحاظ سے یاے مجہول کے تلفظ سے اور اِس آواز کے لیے اُس کی خاص شکل (ے) سے بھی آشنا نہیں۔ اُن کے لیے ی اور ے ایک ہی صورت ہے جو معروف آواز کے لیے آتی ہے۔ ستم یہ ہوا کہ یاے لین کو بھی وہ لوگ ی کی شکل میں لکھنے لگے اور اُن کی دیکھا دیکھی ہمارے یہاں بھی کہیں کہیں اُس کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ اگر جدید فارسی کی روشِ نگارش کے مطابق مثلاً شراب کے معنی میں ''می'' لکھا جائے، تو اُردو میں اِسے (مَے) کوئی نہیں پڑھ پائے گا۔ یہ تو مثلاً ''گرمی'' والا ''می'' ہوگا، یا ''می کند'' والا ''می'' ہوگا۔

جس طرح ''پَے'' کو ''پی'' لکھنا مناسب نہیں، اُسی طرح ''کَے'' کو ''کی'' لکھنا بھی غیر مناسب ہوگا۔ حُسنِ اتفاق سے یہ لفظ اُس غزل کے ایک شعر میں بہ طورِ قافیہ آیا ہے جس کا مطلع ہے:

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　　　نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے

اِس میں یہ شعر بھی ہیں:

انجامِ شمارِ غم نہ پوچھو یہ مصرفِ ''تابہ کَے'' نہیں ہے

جس دل میں کہ ''تابہ کَے'' سما جائے وھاں عزّتِ تختِ کَے نہیں ہے

اس غزل میں دوسرے قوافی ہیں: مَے، شَے، ہَے، قَے، اَے؛ عرشی صاحب نے ''ہے'' کے سوا، ہر قافیے کے پہلے حرف پر زبر لگایا ہے اور آخر میں دراز ے لکھی ہے اور یہ بالکل صحیح اندازِ نگارش ہے۔

یہ نشان دہی خاص کر یوں کی گئی کہ نسخہ عرشی میں (اس غزل سے قطعِ نظر) اکثر مقامات پر ''مَے'' کو ''مَی'' لکھا گیا ہے، اسی طرح ''پَے'' کو ''پَی'' (''پَے'' کے تحت تفصیل لکھی جا چکی ہے)۔ نیز فرہنگِ غالب میں عرشی صاحب نے اِس ''کَے'' کو ''کَی'' لکھا ہے:

''کَی، بہ کافِ مفتوح، بروزنِ مَی، بمعنیِ خداوند و مالک۔ و ''کیا'' مزید علیہ۔ کب، یعنی کس وقت'' (ص ۲۰۷)۔

اِس عبارت کے لیے اُردوے معلّیٰ، قاطعِ برہان اور درفشِ کاویانی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یعنی ہر معنی میں اس کو ''کَی'' لکھا گیا ہے اور یہ املا قابلِ قبول نہیں۔ کَے اور مَے، اِن دونوں لفظوں کے آخر میں ے لکھی جانا چاہیے۔

کیونکے، کیونکہ: ''کیونکے'' اور ''کیوں کہ'' دو مختلف لفظ ہیں، معنی کے لحاظ سے بھی اور محلِّ استعمال کے لحاظ سے بھی۔ ''کیونکے'' محرّف صورت ہے ''کیونکر'' کی (جیسے: جا کر، جاکے۔ لاکر، لاکے۔ لکھ کر، لکھ کے)۔ ''کر'' محرَّف صورت میں ''کے'' بن جاتا ہے۔ ''کیونکہ'' مرکب ہے ''کیوں'' اور ''کہ'' سے۔ ''کیونکہ'' کلمہ بیانیہ ہے اور ''کیونکے'' استفہامیہ۔

ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے اپنے مقالے ''اردو املا'' میں لکھا ہے:

''کیونکر کی جگہ اگلے وقتوں میں ''کیونکے'' بولتے تھے اور ے کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے ''کیونکہ'' (یعنی کیوں کہ، جس میں ''کہ'' بیانیہ ہے)۔ لوگوں نے ''کہ'' اور ''کے'' کے معنوں میں فرق نہ کر کے، ''کیونکے'' کو ''کیونکہ'' بنا دیا، اور

پُرانے اُستادوں سوداؔ، میرؔ، دردؔ وغیرہ کے دیوانوں میں اصلاح فرمادی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں، تصحیف ہے۔

یادرکھنا چاہیے کہ اگر ''کر'' کا قائم مقام ہوتو ''کے'' اور نہیں تو ''کہ'' لکھا جائے، جیسے: نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی (غالبؔ)''۔

(مقالاتِ صدّیقی، جلدِ اوّل)

جن اشعار میں ''کیونکر'' ہے، نسخہ عرشی میں وہاں صحیح طور پر ''کیونکر'' ہی ملتا ہے، دومثالیں:

کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز (ص۱۷۳)

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر (ص۱۸۲)

لیکن جن مقامات پر اس کی محرّف صورت ''کیونکے'' ہونا چاہیے، وہاں ''کیونکہ'' ملتا ہے، مثلاً:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں (ص۱۷۸)

بہ یادِ گرمیِ صحبت، بہ رنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکہ غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی
(ص۷۷)

نہ ہووے کیونکہ اُسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا لہو میں ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے (ص۹۹)

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے (ص۲۱۴)

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن
اُٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ (ص۳۰۳)

اِن سب شعروں میں ''کیونکے'' لکھا جانا چاہیے تھا۔ ''کیونکہ'' سے تو معنی ہی بگڑ جائیں گے۔ اِس کا التزام کیا جانا چاہیے کہ ''کیونکے'' کے محل پر ''کیونکہ'' نہ لکھا جائے۔ دونوں کلموں میں جو معنوی فرق ہے، اُسے لازماً ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

گانو: ''پانو'' کے ذیل میں مرزا صاحب کا یہ قول آچکا ہے کہ ''گانو، قافیہ ہے پانو کا''۔ اِس سے قطعیّت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ''گانو'' صحیح املا مانتے تھے۔ اُن کی دستی تحریروں میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، اِسی طرح لکھا ہوا ملتا ہے۔ دو حوالے: ''ایک گانو جس کا تالڑا نام ہے'' (مکتوب بہ نامِ میر بندہ علی۔ عکس: غالب کے خطوط، ص۸۰۶)۔ ''کوئی گانو لٹ جائے'' (مکتوب بہ نامِ جنونؔ بریلوی۔ عکس نقوش ''لاہور'' خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص۴)۔

گاوزباں: ''خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاوزباں عنبری'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص۲۴۰)۔ مرزا صاحب نے ''گاو'' کے واو پر ہمزہ نہیں لکھا۔ اِس لفظ کا صحیح املا بھی یہی ہے۔ اِس میں واو موقوف ہے، یعنی اُس سے پہلے الف ساکن ہے (گ ا و)۔ اگر اِسے ''گاؤ'' لکھا جائے، تو واو موقوف نہیں رہے گا، ساکن ہو جائے گا (گاءُو) اور ''گانا'' مصدر کا فعل ہو جائے گا (جیسے گانا گاؤ)۔ مرزا صاحب نے ''پانو'' کو ''پاؤں'' لکھنے سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ ''پاؤں'' تو ترجمہ ہے ''یابم'' کا، جس کے معنی ہیں: میں پاؤں۔ ''گاؤ'' اگر لکھا جائے تو اُس کی بھی یہی صورت ہوگی۔

گاڑی: ''یقین ہے کہ اِس سفرِ فیض اثر میں ریل گاڑی کی سواری کی سیر بھی دیکھ لی ہوگی'' (مکتوب بہ نامِ ناظم، عکس: مرقّعِ غالب، ص۲۰۳)۔ ''پُل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب، یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اُسی زمہریر کے میدان میں رہنا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص۱۰۰)۔

اِن دونوں خطوں میں مرزا صاحب نے "گاڈی" (ڈال کے ساتھ) لکھا ہے؛ لہٰذا یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ لغزشِ قلم نہیں، وہ اِس لفظ کو اِسی طرح لکھتے ہوں گے (اور بہ خیالِ غالب بولتے بھی اِسی طرح ہوں گے)۔ اِس بنا پر اُن کی تحریروں میں اِسی املا کی پابندی کی جانا چاہیے۔

گرگدن (کرگدن): مرزا صاحب نے مولفِ برہانِ قاطع پر اعتراض کیا ہے کہ اُس نے "کرگدن" کو "کاف عربی سے لکھا "حال آنکہ کافِ اوّلش نیز فارسیست" (قاطع، ص ۱۱۷)۔ تیغِ تیز میں بھی اِسی اعتراض کو دُہرایا ہے (قاطع ص ۲۸۹)۔ کرگدن، یا بہ قولِ مرزا صاحب "گرگدن" وہی جانور ہے جسے اُردو میں "گینڈا" کہتے ہیں۔ غیاث اللغات اور فرہنگِ فارسی میں اِسے "کرگدن" لکھا گیا ہے (جس طرح مولفِ برہانِ قاطع نے لکھا ہے)۔ عرشی صاحب نے یہ بتایا ہے کہ فرہنگِ رشیدی، سراج اللغۃ اور فرہنگِ انجمن آرائے ناصری میں بھی "کرگدن" ہے۔ اِس طرح مرزا صاحب کا اعتراض درست نہیں؛ اِس کے باوجود اُن کی تحریر میں اِس لفظ کے اُسی املا کی مطابقت اختیار کی جائے گی جسے مرزا صاحب نے صحیح بتایا ہے۔ (یہاں غلطیِ املا نہیں، اختلافِ رائے ہے)۔

گڑھ پھنک: مرزا صاحب نے ایک خط میں اِس کو اِسی طرح لکھا ہے: "عنایت حسین صاحب گڑہ پہنک بن کر اُڑ گئے" (مکتوب بہ نامِ نواب حسین مرزا۔ غالب کے خطوط، ص ۶۷۲)۔

لغت[۱] میں "گڑ پنکھ" ہے۔ مرزا صاحب نے جو "گڑہ پہنک" (گڑھ پھنک) لکھا ہے، اُس کے متعلق عرشی صاحب کی رائے یہ ہے کہ "یہ تلفظ کا اتباع معلوم ہوتا ہے" (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۲۲۹)۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے میں:

۱۔ گڑ پنکھ: اسمِ مذکر، بڑے بڑے پروں والا پرندہ۔ ایک پرندکا نام۔ بچّوں کا ایک کھیل، جس میں کسی شخص کے سیدھے ہاتھ کر کے لکڑی سے باندھ دیتے ہیں اور اُسے بے قابو کر کے، دھوتی یا پیجامہ کھول دیتے ہیں۔ جھابر جھلا۔ بڑے بڑے پائچوں یا ڈھیلی پوشاک پہننے والا آدمی" (فرہنگِ آصفیہ)۔ "گڑ پنکھ بنانا" کسی شخص کو ہنسی میں سوانگ بنانا، احمق بنانا، الّو بنانا، پاگل بنانا، تماشا بنانا" (ایضاً)۔

"دلّی کی زبان میں مخلوط ھ پر کبھی قلب کا عمل ہوتا ہے۔ ایک خط میں غالب نے "گڑ پنکھ" کو "گڑھ پھنک" لکھا ہے۔ ایک دوسرے خط میں بھی یہ لفظ آیا ہے، اور م ا[1] کے کاتب نے "گڑ پھنک" لکھا[2] ہے.... ظاہر ہے کہ م ا کے کاتب نے کوئی تصرّف اِن لفظوں میں نہیں کیا" (مقدّمہ خطوطِ غالب، ص ی)۔

چوں کہ یہاں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مرزا صاحب کا سہوِ قلم ہے، بہ قولِ عرشی صاحب یہ تلفظ کا اتباع بھی ہوسکتا ہے؛ اِس غیر یقینی صورت میں یہ تو مناسب نہیں ہوگا کہ متن میں تبدیلی کی جائے۔ مناسب یہی ہوگا کہ حاشیے میں وضاحت کی جائے اور متن میں "گڑھ پھنک" کو برقرار رکھا جائے۔

گِلہ: عرشی صاحب نے مقدّمہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے: "لفظِ گلہ، بہ معنیِ شکوہ کو، خوش خط

۱۔ مراد ہے "اردوئے معلّیٰ کے حصّہ اول کی پہلی اشاعت، اکمل المطابع دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء"۔

۲۔ صدّیقی صاحب نے حاشیے میں اِس کے لیے یہ حوالہ دیا ہے: "سیّد سجّاد مرزا کے نام کا خط، جس کا اصل نسخہ میرے سامنے ہے"۔ یعنی صدّیقی صاحب کے قول کے مطابق اپنے قلم سے مرزا صاحب نے جس خط میں 'گڑھ پھنک' لکھا ہے، وہ سید سجّاد مرزا کے نام ہے اور یہ کہ وہ خط (اصل خط) اُن کے سامنے تھا۔ غالب کے خطوط میں یہ خط شامل ہے اور اس میں یہ خط "نواب حسین مرزا" کے نام ہے۔ حصّہ حواشی میں مرتّب نے لکھا ہے کہ اصل خط پیشِ نظر ہے۔ اصل خط تو ایک ہی ہوگا۔ اب یہ خط کہاں ہے، مرتّب نے اِس کی نشان دہی نہیں کی اور نہ یہ بتایا کہ یہ خط اُن کو کہاں سے ملا۔ میں بہ طورِ خود یہ تعیّن نہیں کرسکتا کہ اصلاً خط کس کے نام ہے؛ سجّاد مرزا کے نام یا حسین مرزا کے نام۔ اِن دونوں کے نام خط اِس مجموعے میں شامل ہیں۔ میں اِس سلسلے میں بھی کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتا کہ جو اصل خط صدّیقی صاحب کے سامنے تھا اور جس میں زیرِ بحث لفظ شامل تھا؛ کیا وہ اس خط سے مختلف ہے، جس کا حوالہ حسین مرزا کے نام سے دیا گیا ہے، یا یہ کہ ناموں میں خلطِ مبحث ہوا ہے۔ جب تک اصل خط کو نہ دیکھا جائے، اِس سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی۔ پسِ نوشت: اِس خط کا عکس علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء میں شامل ہے اور اُس میں اِس خط کو "معین الدّولہ ذوالفقار حیدر خاں معروف بہ حسین مرزا" کے نام لکھا گیا ہے۔ میگزین کے اڈیٹر ڈاکٹر مختار الدّین احمد نے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے کہ چار اصل خط اُن کو ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے "ازراہِ نوازش عنایت فرمائے ہیں" اُن میں یہ خط بھی شامل ہے۔ غالباً ناموں کے تعیّن میں صدّیقی صاحب سے سہو ہوا ہے۔ پھر بھی اصل خط کا دیکھا جانا ضروری ہے۔

دیوانِ اُردو کے کاتب نے ہر جگہ ''گلا'' لکھا ہے۔ میرزا صاحب نے کسی جگہ اِس کی تصحیح نہیں کی؛ لیکن ناظم کے مسودے میں ''گلہ'' لکھا ہے۔ اِس سے یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ آخرِ عمر میں عربی فارسی کے اُن لفظوں کو بھی، جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں، ہاے مختفی سے لکھنا پسند کرتے تھے'' (ص ۲۲۸)۔

''آخرِ عمر'' کی حد بندی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مرزا صاحب کی جس قدر دستی تحریریں عکسی صورت میں پیشِ نظر ہیں، اُن میں ''گلا'' ایک جگہ بھی نہیں ملتا، البتہ ''گلہ'' کئی جگہ ہے: ''خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ ہے۔ گلہ یہ کہ'' (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۳)۔ یہ خط ۷رنومبر ۱۸۵۸ء کا ہے۔

علائی کے نام ایک خط میں فارسی اشعار میں تین جگہ ''گلہ'' آیا ہے (عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۸۹)۔ مرتب کی راے میں یہ خط جولائی ۱۸۶۲ء کا ہے۔ تفتہ کے نام خط میں بھی ایک فارسی مصرع میں ''گلہ'' آیا ہے (عکس: خطوطِ غالب، ص ۶ کے مقابل)۔ یہ خط ۲۲ رمارچ ۱۸۵۲ء کا ہے۔

غرض کہ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں صرف ''گلہ'' ملتا ہے اور بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب شروع ہی سے اِس لفظ کو اِسی طرح لکھتے رہے ہیں۔ جہاں تک ''خوش خط دیوانِ اُردو کے کاتب'' کا تعلق ہے، تو اُس کا لکھنا سند نہیں ہوسکتا۔ اور پھر یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے نسخہ لاہور میں (جس کے متعلق عرشی صاحب کا خیال یہ ہے کہ وہ ''نواب فخرالدّین محمد خاں بہادر کا لکھا ہوا ہے، جو میرزا صاحب کے مشہور اور پسندیدہ کاتب تھے'' (مقدمۂ دیوانِ غالب نسخہ عرشی، ص ۸۴) ہر جگہ (قافیے سے قطعِ نظر) ''گلہ'' ہی ملتا ہے، مثلاً: ص ۱۵، ص ۱۷، ص ۱۹، ص ۵۶۔

غرض کہ اِس لفظ کا صحیح املا ''گلہ'' ہے اور مرزا صاحب نے اپنے قلم سے اِسے اِسی طرح لکھا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عرشی صاحب نے نسخہ عرشی میں عموماً (قافیے کی مجبوری سے قطعِ نظر) ''گلہ'' ہی لکھا ہے، مثلاً:

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا (ص ۱۴۷)

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہرچند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو (ص ۱۹۴)

تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا (ص ۱۵۸)

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اِس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا (ص ۱۵۸)

گُودھنا: مرزا صاحب نے قاطعِ برہان میں لکھا ہے:

''آژدنی ہست کہ آنرا در ہند ''گودھنا'' گویند، بہ کافِ عجمیِ مضموم و واوِ معروف و دالِ مختلط التلفظ بہ ہاے ہوز؛ وآں خستنِ تن است بہ زخمِ سوزن و آگندنِ نیل دراں رخنہ ہا، چنانکہ در ہند زنانِ روستابیش تر بر سینہ و گردن و ساعد و بازو ایں صنعت بہ کار برند و انواعِ نقوش انگیزند'' (قاطع، ص ۲۱)۔

گورمنٹ: یہ لفظ مرزا صاحب کی تحریروں میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اُنھوں نے اِسی طرح لکھا ہے۔ صرف دو مثالیں: ''یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورمنٹ کا حکمِ منظوری اِس تحریر پر متفرع ہے'' (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۹۸)۔ ''گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں لمبر اور سات پارچے اور جیغہ سرپیچ، مالاے مروارید خلعت مقرر ہے'' (مکتوب بہ نامِ ایضاً۔ عکس: ص ۲۱۸)۔

خود ہے تدارک اِس کا گورمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالبؔ ہے جس کا نام

(نسخۂ عرشی، ص ۲۸۳)

گورنر جنرل: ''عرضی بحضور... نواب گورنر جنرل بہادر گزرانیدن میخواہم'' [عرضیِ مرزا

غالبؔ (بہ خطِ غالبؔ)۔ عکس: نامہ ہای فارسیِ غالبؔ، ص۱۱۶ کے مقابل)۔

گھٹا (گٹھا): نوّاب کلبِ علی خاں کی مدح میں مرزا صاحب نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا، جس کا حوالہ لفظِ "خورّم" اور "سانون" کے تحت آچکا ہے، اُسی قطعے میں یہ شعر ہے:

جس طرح باغ میں سانون کی گٹھائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم

(عکس: مرقّعِ غالبؔ، ص۱۸۱)۔ اِس میں "گہٹائیں" لکھا ہوا ہے۔ بہ ظاہر یہ سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے۔ "گھٹائیں" کا بے خیالی میں "گہٹائیں" (یعنی گٹھائیں) بن جانا کچھ ایسا مستبعد نہیں۔ عرشؔی صاحب نے مقدّمہ مکاتیبِ غالبؔ میں اِسے غلطی مانا ہے (ص۲۳۲)۔ اُنھوں نے نسخہ عرشؔی میں اِس شعر میں "گھٹائیں" لکھا ہے (ص ۲۶۵)۔ بہ ظاہر یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اِس بنا پر اِس شعر میں (اور جہاں اور کہیں یہ لفظ ہو، وہاں بھی) صحیح لفظ "گھٹائیں" لکھنا چاہیے۔

گھنٹا: "گھنٹا بھر بیٹھا رہا کہ حضرت آئے" (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں: عکس مرقّعِ غالبؔ، ص۲۹۴)

لاچار (ناچار): مرزا صاحب کی وہ غزل، جس کا مطلع ہے (نسخہ عرشؔی، ص۵۵):

ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم   رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم

اِس کا مقطع ہے:

اسدؔ! شکوہ کفرو دُعا ناسپاسی   ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

ضمیمہ اختلافِ نسخ میں عرشؔی صاحب نے اِس مقطعے کے حوالے سے لکھا ہے:

"ق، قا: لاچار۔ آخر میں غالبؔ نے "ناچار" لکھنا شروع کر دیا تھا اور "لاچار" کو غلطِ محض قرار دے دیا تھا (مکاتیبِ غالبؔ، ۹۴، طبعِ چہارم) اِس لیے متن میں "ناچار" لکھا گیا ہے" (ص۴۰۹)۔

یعنی خطی نسخوں میں، جن کو نسخۂ عرشی کے متن کی بنیاد بنایا گیا ہے، ''لاچار ہیں'' لکھا ہوا ہے۔ اُس کی جگہ ''ناچار'' مرتّب نے لکھا ہے۔ وجہ اِس کی یہ بتائی ہے کہ مرزا صاحب نے آخر میں اِس لفظ کو ترک کر دیا تھا۔ عرشی صاحب کا یہ قول مرزا صاحب کی ایک اصلاح پر مبنی ہے۔ بیتاب رام پوری کا شعر تھا:

حق تو یہ ہے، خوب ہی دی غیر کو رونق، مگر

باوفا کیوں کر بناتے اُس کو تم لاچار ہو

اِس پر مرزا صاحب نے یہ حاشیہ لکھا: ''لاچار غلطِ محض ہے، ناچار بہ نون صحیح ہے'' (مکاتیبِ غالب، ص۹۴)۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے منقولہ بالا مقطعے میں ''لاچار'' کو خود نہیں بدلا، اُسے مرتّب نے بدلا ہے اور کسی مرتّب کو (وہ استادِ معظّم عرشی صاحب کیوں نہ ہوں) یہ حق حاصل نہیں کہ وہ متن میں از خود کسی لفظ کو بدل دے۔ اگر عرشی صاحب نے وضاحت نہ کی ہوتی، تو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ مرزا صاحب نے ''لاچار'' لکھا تھا۔ جب تک مصنف کسی تبدیلی کو عمل میں نہ لائے، کسی دوسرے شخص کو، کسی بھی عنوان سے اُسے عمل میں لانے کا حق نہیں۔ نسخۂ کالی داس گپتا رضا میں محولہ بالا غزل کے مقطعے میں ''لاچار ہیں ہم'' ہی ہے (ص ۱۹۹) اور یہاں یہی درست ہے۔

''لاچار'' مستعمل رہا ہے (اور اب بھی مستعمل ہے۔ ''لاچاری'' بھی مستعمل ہے)۔ ذوق کا معروف مقطع ہے:

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق، وگرنہ

سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

(کلّیاتِ ذوق، مرتبہ تنویر احمد علوی، لاہور، ص۱۴۳)

ہاں، مرزا صاحب کے اِس شعر میں ''ناچار'' آیا ہے:

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھائیے　　دُشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

(نسخۂ عرشی، ص۲۱۰)

لاچار اور ناچار میں محض املا کا اختلاف نہیں؛ "لا" اور "نا" کی تبدیلی نے لفظ کو بدل دیا ہے اور اِس طرح یہ دو لفظ بن گئے ہیں۔ مرزا صاحب کے پہلے مقطعے میں "لاچار" اور دوسرے شعر میں "ناچار" لکھا جانا چاہیے۔

لارڈ: انگریزی لفظ "لارڈ" کو مرزا صاحب نے ہر جگہ "لارڈ" لکھا ہے (ل۔ا۔ڑ۔د): "نوّاب گورنر جنرل لارڈ کیننگ" (مکتوب بہ نامِ ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۰۶)۔ "لارڈ ہاردنگ صاحب" (ایضاً، ص ۲۱۸)، "لارڈ دلہوسی یہاں آئے نہیں" (ایضاً)۔ "جناب لارڈ صاحب بہادر سے ملاقات کا ہونا" (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۵۹) "لارڈ صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے" (مکتوب بہ نامِ ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۲۳)۔

لفٹنٹ: دلّی علاقۂ لفٹنٹ گورنری سے انقطاع پا گئی اور احاطۂ پنجاب کے تحتِ حکومت آ گئی" (مکتوب بہ نامِ نعیم الحق آزاد۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۲۵۷)۔ "جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا" (مکتوب بہ نامِ نوّاب ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۲۳)۔ "لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے" (مکتوب بہ نامِ ناظم۔ عکس: ایضاً، ص ۲۰۶)۔ "بڑے میرے مربّی، قدردان جناب اڈمنسٹن صاحب، وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے، لفٹنٹ گورنر ہوگئے" (مکتوب بہ نامِ نوّاب ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۸)۔

لگاو: "فارسی زبان سے لگاو اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبیعی تھا" (مکتوب بہ نامِ[1] مولوی ضیاء الدّین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۴۸ کے مقابل)۔ "میری طبیعت

۱۔ اِس خط کے حوالے اِس کتاب میں کئی جگہ آئے ہیں مختلف الفاظ کے تحت۔ اِس خط کے حوالے سے متعلق ایک ضروری وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کا ایک طویل مقالہ دو قسطوں میں ہندستانی (الٰہ آباد) میں شائع ہوا تھا۔ پہلی قسط کا عنوان تھا: کچھ بکھرے ورق۔ یہ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ دوسری قسط کا عنوان ہے: کچھ اور بکھرے ورق (اپریل ۱۹۳۴ء)۔ دونوں قسطوں میں غالب کے نئے دست یاب خطوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور بعض خطوں کے عکس بھی شائع کیے گئے ہیں۔ فی الوقت اِس کی دوسری قسط میرے سامنے ہے۔ اِس قسط میں جن خطوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اُن میں یہ خط بھی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"اب اِس اشاعت میں کچھ اور بکھرے ورق پیش ہیں۔ جن خطوں کے...

کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا'' بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں: مرقعِ غالب، ص ۵۲۱)۔ یہ لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ واو پر ہمزہ نہیں، دوسری جگہ واو پر ہمزہ ہے۔ مرزا صاحب نے اِس قماش کے تین لفظوں کو (جن میں اِس لفظ کی طرح الف کے بعد واو ہے) ہمزہ کے بغیر

.....عکس اور نقلیں اِن میں شامل ہیں، وہ اب تک شائع نہیں ہوئے اور

اُن کے اصل نسخے خود غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے پیشِ نظر ہیں۔ یہ چند خط پچھلے چھے سات برس کے عرصے میں تین مختلف جگہوں، یعنی کاکوری، لکھنؤ اور دلّی سے فراہم ہوئے ہیں.....دلّی والا خط ایک کاغذ کا بند...کل ۲۷ سطریں ہیں.... بائیں جانب مُہر ہے جس میں ''غالب ۱۲۷۸'' صاف پڑھا جاتا ہے۔ اِس خط کے ساتھ ایک رقعہ بھی ملا....مکتوب الیہ مولوی ضیاء الدّین خاں دہلوی.....تھے''۔

اِس تعارف کے بعد محوّلہ بالا خط کا مکمل متن پیش کیا ہے اور اُس رقعے کا متن بھی پیش کیا ہے جو مولوی صاحب ہی کے نام ہے۔ ساتھ ہی اِس مختصر رقعے کا مکمل عکس چھاپا ہے اور اُس طویل خط کے شروع کے حصّے کا عکس شامل کیا ہے، جس میں نو سطریں ہیں۔ نیز خط کے آخری چار سطروں کا عکس بھی شائع کیا ہے۔

اِس خط کا مکمل عکس اور اُس رقعے کا مکمل عکس اِس کے بعد دو جگہ شائع ہوا ہے۔ زمانی ترتیب کے لحاظ سے پہلے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء میں۔ اور اُس کے بعد غالب کے خطوط میں۔ علی گڑھ میگزین کے مدیر ڈاکٹر مختار الدّین آرزو نے ادارتی نوٹ میں یہ وضاحت کر دی کہ اِس میگزین میں شامل چار خط ''ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے از راہِ نوازش عنایت فرمائے ہیں'' اِن میں یہ دونوں خط بھی ہیں (دو تو یہی خط ہیں اور دو خط تحسین مرزا کے نام ہیں)۔ آرزو صاحب نے صراحت نہیں کی کہ صدّیقی صاحب نے اِن چاروں خطوں کے عکس دیے تھے یا اصل خط دے دیے تھے۔ یہ بات یوں پیدا ہوئی کہ غالب کے خطوط میں یہ نہیں بتایا گیا کہ مرتّب کو یہ خط کہاں سے ملے (اِس مجموعے میں اِن چاروں خطوں کے عکس شامل ہیں) نتیجتاً یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اب یہ چاروں اصل خط کہاں ہیں۔ مرتّب نے مولوی ضیاء الدّین خاں کے خط کے تحت وضاحت ضرور کی ہے کہ ''اِس خط کا عکس پہلی بار ہندستانی الٰہ آباد ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا''۔ ہندستانی میں مکمل خط کا عکس شائع نہیں ہوا تھا، مکمل متن شائع ہوا تھا۔ عکس تو صرف تیرہ سطروں کا شائع ہوا تھا۔

بہ ہر طور، میں نے یہ وضاحت محض اِس لیے کی ہے کہ صحیح صورتِ حال سامنے آ جائے کہ یہاں میں نے پہلے ماخذ سے استفادہ کیوں نہیں کیا اور علی گڑھ میگزین سے عبارت نقل کیوں کی۔

لکھا ہے۔ یہ لفظ ہیں: اُلجھاو، واو (تین بار)، گاو۔ اِن کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔ اِس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرزا صاحب نے ایسے لفظوں کو بیش تر مع واوِ موقوف (الجھاو، راو، گاو، لگاو) لکھا ہے؛ بس ایک جگہ ''لگاؤ'' لکھا ہے۔ اِس صورت میں ہر لحاظ سے (یعنی بہ لحاظِ قواعد بھی، اور یوں بھی کہ مرزا صاحب نے بیش تر اِسی طرح لکھا ہے) بہتر اور مناسب تر یہی ہوگا کہ ''لگاؤ'' (مع واوِ موقوف) کو مرجّح قرار دیا جائے اور کلامِ غالب میں اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جائے، مثلاً اِن اشعار میں:

جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا | لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاو
لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں | لاکھوں لگاو، ایک چُرانا نگاہ کا
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی | اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناو ہیں

لمبر: ''دربار میں داہنی صف میں دسواں لمبر'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب ناظم۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۱۸)۔ ''کلکتہ محلّہ کاشی پور لمبر ۵'' (مرقّعِ غالب، ص ۲۶۱)۔ کلکتہ محلّہ کاشی پور، خانہ لمبر ۶ اور لمبر ۵'' (ایضاً، ص ۲۴۱)۔ کئی اشعار میں بھی یہ لفظ آیا ہے اور نسخہ عرشی میں (صحیح طور پر) ''لمبر'' ہی ہے:

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم | لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
(ص ۲۸۲)

اُس بزمِ پُر فروغ میں اِس تیرہ بخت کو | لمبر ملا نشیب میں از روے اہتمام
(ص ۲۸۲)

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کُلاہ | مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
(ص ۲۸۷)

متاخّرین: ''متاخّرین کا قول متقدّمین کے کلام کا ناسخ نہیں'' (مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدّین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء)۔ ''متاخّرین میں سے بھی عبدالقادر بیدلؔ کہتا ہے'' (ایضاً، ص ۴۳۷)۔ ''متقدّمین از راہِ تحکّم و زبردستی بہت کچھ کہہ گئے ہیں، متاخّرین نے ترک کر دیا ہے'' (مکتوب بہ نامِ فرقانیؔ میرٹھی۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۲۹۷)۔

عربی کے لحاظ سے ''متأخر'' لکھنا چاہیے (اسی طرح مؤخر: المنجد)۔ اردو میں عام طور پر ایسے عربی الفاظ میں الف (یا واو پر) ہمزہ لکھنے کا رواج نہیں۔ مرزا صاحب نے بھی اِسی کے مطابق ''متاخرین'' لکھا ہے۔ کلامِ غالب میں ایسے لفظوں کو اِسی طرح (ہمزہ کے بغیر) لکھنا چاہیے: متاخر، متاخرین، موخر۔ (اس سلسلے میں مزید دیکھیے اِسی گوشوارے میں ''تامّل'')۔

متکلف: (تاس متکاف) دیکھیے: تاس۔

مونّث: ''مقدّر مذکّر اور تقدیر مونّث ... کوئی بھی مقدّر کو مونّث نہ لکھتا ہوگا۔ (مکتوب بہ نامِ میر مہدی مجروحؔ۔ عکس: خطوطِ غالب، ص ۲۸۱ کے مقابل)۔

مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ''مونّث'' کئی جگہ ملتا ہے اور ہر جگہ اِسی طرح (عربی میں ''مؤنث'' ہے (المنجد) یعنی واو پر ہمزہ ہے)۔

مجھ، مجھے، مجکو، تجکو، تجھ کو: مجھ، مجھ سے، مجھ پر، مجھ میں، مجھ تک؛ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ہر جگہ اِن لفظوں کا املاؔ کے ساتھ ملتا ہے (یعنی ہائے مخلوط کے ساتھ، جسے اُس زمانے میں عموماً سادہ ہ سے ظاہر کیا جاتا تھا اور مرزا صاحب بھی اِسی طرح لکھتے تھے، مثلاً: مجہے، مجہسے۔ کہیں مجہ پر، مجہ تک) محض ضابطے کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند حوالے پیش کیے جاتے ہیں (صرف چند حوالے یوں کہ مرزا صاحب کی تحریروں میں اِن لفظوں کا یہی املا ملتا ہے):

''مجھ میں کچھ باقی نہیں''، عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۱۲)۔ ''مجھے کیا یاد رہے گا'' (ایضاً، ص ۲۵۱)۔ ''مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے'' (ایضاً، ص ۲۳۳)۔ ''مجھے ہر طرح کی نظم ونثر سے خوشی اور خشنودی مراد ہے'' (ایضاً، ص ۲۳۷)۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے'' (ایضاً، ص ۲۵۱)۔ ''وہیں مجھ سے آ کر ملے'' (''ص ۲۴۲)۔ ''تو اب مرزا نے مجھ پر ستم کیا'' (ایضاً، ص ۲۳۹)۔ ''مجھ تک'' (ایضاً، ص ۲۱۳)۔ ''مجھ پر اور میری بی بی پر'' (ایضاً، ص ۲۲۸)۔

اِس سلسلے کا ایک لفظ مرزا صاحب کی تحریروں میں ہر جگہ ہ کے بغیر ''مجکو'' ملتا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ ہر جگہ اِسی طرح ملتا ہے، اِس لیے صرف دو حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں: ''اِس

نذر کے مقبول ہونے سے مجکو بہت خوشی حاصل ہوئی'' (مرقعِ غالب، ص ۲۰۰)۔ ''توقعِ نوکری کا حال مجکو مفصّل معلوم ہے'' (خطوطِ غالب، ص ۲۸۱ کے مقابل)۔

اِس کے ساتھ کا دوسرا لفظ ''تجکو'' ہے۔ مرزا صاحب نے اِسے بھی ہ (یعنی ھ) کے بغیر لکھا ہے: ''خدا نے تجکو عطا کی ہے گوہر افشانی'' (مرقعِ غالب، ص ۱۷۹)؛ لیکن مکاتیبِ غالب میں منقول کلامِ بیتاب رام پوری کی اصلاحوں کے ذیل میں ایک مصرعے میں مرزا صاحب نے ''تجھ کو'' لکھا ہے۔ بیتاب کا مصرع تھا: ''اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہے تجھ پہ کیا قلق''۔ مرزا صاحب نے ''تجھ پہ'' کو قلم زد کر کے اُس کی جگہ ''تجھ کو'' لکھ دیا (ص ۹۱)۔ اِس طرح مرزا صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی اِس لفظ کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔

مجھ سے، مجھ پر، مجھ تک، مجھ میں؛ اِن کلموں میں تو خود مرزا صاحب نے ہ لکھی ہے (اور اصلاً بھی اِن میں ہ بہ صورتِ ھ ہے) اِس لیے اِن سب لفظوں کا املا اِسی طرح درست مانا جائے گا۔

جہاں تک ''مجکو'' کا تعلق ہے، تو اصلاً اِس میں بھی ہ ہے، اصل لفظ ''مجھ'' کو خود مرزا صاحب نے ہر جگہ ہ کے ساتھ لکھا ہے، کسی ایک جگہ بھی ہ کے بغیر (مج) نہیں لکھا؛ اِس بنا پر اگر یہ مان لیا جائے کہ اِس کے ساتھ کے دوسرے لفظوں کی طرح اِسے بھی ''مجھ کو'' لکھا جائے گا، تو یہ بہتر ہوگا۔

اِس سلسلے میں تائید کے لیے ایک بات یہ بھی ہے کہ بیتاب رام پوری کی ایک ایسی غزل کے تین شعروں پر مرزا صاحب نے اصلاح دی ہے، جس کی ردیف ''مجھ کو'' ہے اور اِس ردیف کو اِسی طرح رہنے دیا گیا، یعنی مرزا صاحب نے ''مجھ کو'' میں اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کی، اِسے صحیح سمجھا اور برقرار رکھا۔ اِس سلسلے میں عرشی صاحب کی اِس عبارت کو بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے:

> ''میرزا صاحب تلفظ کے اتباع میں ''مجکو'' بہ خذفِ ہاے مخلوط لکھا کرتے تھے۔ اُن کے دیوانِ اُردو کے اُس نسخے میں

بھی، جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے، ''مجکو'' اور ''مجسے'' تحریر ہے، مگر میں نے صحیح املے کو ترجیح دیتے ہوئے، ہر جگہ ''مجھ کو'' بنا دیا ہے'' (حواشیِ مکاتیبِ غالب، ص ۱۲۲)۔

عرشی صاحب نے اِس لفظ کے سلسلے میں صحیح طریقہ کار اپنایا ہے۔ اِس بات کو مان لینے میں کسی طرح کی قباحت پیدا نہیں ہوتی کہ مجھ، مجھ سے، مجھ پر، مجھ میں، مجھ تک کی طرح ''مجھ کو'' لکھا جائے۔ اِسی طرح تجھ، تجھ سے، تجھ میں، تجھ پر، تجھ تک، تجھ کو۔ محض بہ طورِ مثال نسخۂ عرشی سے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں:

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

(ص ۱۷۷)

دیوانگی ہے، تجھ کو درسِ خرام دینا　　موجِ بہار، یکسر زنجیرِ نقشِ پا ہے (ص ۹۴)

نسخۂ عرشی میں ''مجھ کو'' اور ''تجھ کو'' اِسی طرح، یعنی دونوں ٹکڑے الگ الگ لکھے ہوئے ہیں اور یہی بہتر صورت ہے۔ ایسے سبھی لفظوں میں دونوں اجزا کو منفصل ہی لکھنا چاہیے، یعنی: مجھ میں، مجھ پر، مجھ پہ، مجھ تک۔ مجھ کو، تجھ کو، تجھ سے، تجھ پر، تجھ پہ، تجھ میں۔

مرزا، میرزا: مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں یہ دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ غالب کے خطوط میں مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے جتنے عکس شامل ہیں، اُن میں میرے شمار کے مطابق تیرہ جگہ ''میرزا'' آیا ہے اور پندرہ جملوں میں ''مرزا'' ہے۔ اِس تفصیل کے مطابق: محمود میرزا (ص ۳۵ے)، میرزا علاء الدین (۷۶۰)، مرزا یوسف علی خاں (۸۰۳)، تکیۂ مرزا صائب، (۸۰۳)، مرزا میر صاحب (۸۰۶) مرزا دولھا (۸۰۶) اکبر میرزا، (۸۱۳) مظفر میرزا، (۸۱۳) سجاد میرزا، (۸۱۴) باقر میرزا (۸۱۴) محمد میرزا (۸۱۴)، مظفر میرزا (۸۱۴)، یوسف مرزا (۳۷۷)، مرزا علاء الدین خاں (۱۲۶۳)، نواب مرزا خاں (۱۲۸۳)، نواب مرزا خاں (۱۲۸۷)، میرزا طاہر وحید (۱۲۸۹)، میرزا جلالاے طبای (کذا) (۱۲۸۹)، نواب مرزا خاں (۱۲۹۱)، میرزا شہاب الدین خاں (۱۲۹۷)، میرزا رحیم الدین (۱۳۰۰)، میرزا جلال اسیر (۱۳۰۶)، نواب مرزا خاں (۱۳۰۶)، نواب مرزا خاں (۱۳۰۶)، نواب مرزا خاں (۱۳۰۷)،

نوّاب مرزا خاں (۱۳۰۸)، مرزا عباد اللہ بیگ (۱۵۷۳)، میرو مرزا (مراد ہیں میر تقی اور مرزا سودا۔ ۷۲۹)۔

ایک خط کی ایک سطر میں ''میرزا'' ہے اور دوسری سطر میں ''مرزا''۔ ایک جگہ ''میرزا علاؤالدّین خاں بہادر'' ہے (۷۶۰)۔ اور دوسری جگہ اِسی نام میں ''مرزا'' لکھا ہے (۱۲۶۳)۔ ہاں داغ کا نام ہر جگہ ''نوّاب مرزا'' لکھا ہے۔ ایک خط میں ''یوسف مرزا'' لکھا ہے (۳۷۷) اور ایک غزل کا مصرع ہے: میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے۔ (اِس کے لیے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وزنِ شعر کی وجہ سے یہاں اِس طرح آیا ہے)۔

مرتّبِ کلامِ غالب کو اِس سلسلے میں کوئی طریقۂ کار طے کرنا ہوگا۔ ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو نام دستی تحریروں میں جہاں جس طرح آیا ہے، اُسے اُسی طرح لکھا جائے۔ جو نام دوسری تحریروں میں ملتے ہیں، اُن کو اُن تحریروں کے اوّلین معتبر مآخذ کے مطابق لکھا جائے۔ بہ ہر طور، اِس سلسلے میں مرتّب کو کسی طریقۂ کار کا تعیّن کرنا ہوگا۔

مزا: ''وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ مزا، نہ نری عربی میں وہ ذوق'' (مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاءالدّین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۴۹۔۱۹۴۸ء)۔ ''اُس کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ نے بڑا مزا دیا'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۴۶)۔

فارسی میں ''مزہ'' ہے (بہارِ عجم، فرہنگِ فارسی)۔ مرزا صاحب نے اِسے الف کے

۱۔ ''میرزا... امیرزادہ، فرزندِ امیر، شاہزادہ؛ باین معنی در عہدِ سربداران و تیموریان و صفویان ''میرزا'' با وّل و آخرِ اسامی افزودہ میشد: میرزا شاہرخ، شاہرخ میرزا؛ مرزا بایسنقر۔ و در عہدِ قاجاریہ بآخرِ اسامی: محمد علی میرزا، احمد میرزا'' (فرہنگِ فارسی، جلدِ چہارم)۔

بہارِ عجم میں مرزا اور میرزا، دونوں لفظ ہیں، لیکن ایرانی فارسی میں اور ایرانی لغات میں بہ طورِ عموم ''میرزا'' ملتا ہے۔ فرہنگِ فارسی میں ''مرزا'' موجود نہیں۔ ہندستان میں مرزا اور میرزا، دونوں لفظ مستعمل رہے ہیں، مگر فارسی میں عموماً ''میرزا'' اور اُردو میں مرزا اور میرزا دونوں (کسی امتیاز کے بغیر)۔

۲۔ چہ شکستہ بختِ داڑوں مزۂ شرابِ مارا = بہ شرابِ مافگندہ نمکِ کبابِ مارا (سعید اشرف۔ بہارِ عجم)
(بہارِ عجم کے پیشِ نظر نسخے میں ''فگندہ'' ہی چھپا ہوا ہے گاف کے ساتھ، اُسی کے مطابق نقل کیا گیا ہے)۔

ساتھ لکھا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں صرف ''مزہ'' ہے؛ مگر یہ ضرور ہے کہ اُردو کی پرانی تحریروں میں ''مزا'' بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ بہ ہر طور، مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی تحریر کے مطابق ''مزا'' ہی لکھا جانا چاہیے۔ عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں ''مزا'' ہی لکھا ہے:

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک　　کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

(ص ۱۷۵)

بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے　　وہ گدا، جس کو نہ ہو خوے سوال، اچھا ہے

(ص ۲۳۹)

دے مجھ کو شکایت کی اجازت، کہ ستمگر　　کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

(ص ۲۳۴)

غالبؔ! مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو　　پیتا ہوں دُھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

(ص ۱۹۶)

مُطمئنّہ: ''حضرت یعقوب علیہ السّلام باآنکہ نبی تھے اور نفسِ مطمینہ رکھتے تھے'' (عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۲۷)۔ ایک دوسرے خط میں مرزا صاحب نے ''مُطمئنّہ'' لکھا ہے: ''اب مجھے اِس امرِ خاص میں نفسِ مُطمئنّہ حاصل ہے'' (مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقّعِ غالب، ص ۲۵۱)۔

مُعمّا: یہ لفظ مرزا صاحب کی کسی دستی تحریر میں تو نہیں ملا، مگر مرزا صاحب نے اِسے کئی شعروں میں اِس طرح نظم کیا ہے کہ صحیح املا کا تعیّن ہو جاتا ہے، کہ اِس کے آخر میں الف ہے؛ یعنی صحیح لفظ ''معمّا'' ہے، ''معمّہ'' نہیں (جس طرح اب کچھ لوگ لکھنے[1] لگے ہیں)۔ ایسے دو شعر:

۱۔ فانیؔ کا معروف شعر ہے:

اک معمّا ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

یار لوگ اِس کو لکھتے ہیں تو ''معمّہ'' لکھ کر، لفظ کی بھی صورت بگاڑ دیتے ہیں اور مصرعے کو بھی داغ دار بنا دیتے ہیں۔

عبرت طلب ہے حلِ معمائے آگہی　　شبنم، گدازِ آئنہ اعتبار ہے (نسخہ عرشی، ص ۹۰)

معمائے تکلف، سر بہ مُہرِ چشم پوشیدن　　گدازِ شمعِ محفل، پیچشِ طومارِ بستر ہے

(ایضاً، ص ۸۵)

مولانا۔مولنا: عرشی صاحب نے مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے:

> مولانا اور اولانا کی کتابت میں میرزا صاحب کے یہاں دورنگی پائی جاتی ہے۔ ایک مکتوب میں اُنھوں نے "مولانا" لکھا ہے، مگر اُس کے سولہ دن بعد "مولنا" اور "اولنا" لکھا ہے"
>
> (ص ۲۳۲)۔

مکتوب بہ نامِ مولوی نعمان احمد میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: "مولنا و بالفضل[1] اولینا" (عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۴۵۳)۔

مکاتیبِ غالب میں پہلا خط فارسی میں ہے، بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم، اُس میں مرزا صاحب نے "مولانا" لکھا ہے: "وہم امروز کہ فردائے ورودِ نوازش نامۂ مولاناست" (ص ۳)۔ اِس کے بعد کا خط بھی فارسی میں ہے، اُس میں یہ جملہ ہے: "نامۂ مولنا و بالفضل اولنا بمن رسید" (ص ۵)۔

یہ بات مرتب یا مرتبین کے طے کرنے کی ہے کہ اِن لفظوں کی کن صورتوں کو ترجیح دی جائے۔ طے کرنا یوں ضروری ہے کہ املائی دورنگی نہ پیدا ہو۔ اِس کی وضاحت ایک مثال سے بہتر طور پر ہو سکے گی۔ قاضی عبدالودود صاحب نے قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ کا متن مرتب کیا تھا، اُس مجموعے میں تیغِ تیز بھی شامل ہے۔ اُس میں ایک جملہ یوں لکھا ہوا ہے: "ہر مزد، ثم مولانا و اولنا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمۃ نے کہا ہے" (قاطع، ص ۲۷۲)۔

۱۔ مرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے (ایک زائد الف کے ساتھ)۔ یہاں نقل مطابقِ اصل کے طور پر اِسے لکھا گیا ہے، اس سے متعلق گفتگو دوسرے حصے میں کی جائے گی۔ معلوم نہیں مولوی نعمان احمد نے اِسے کیا سمجھا ہوگا۔

''مولانا'' اور ''اولنا'' کو مختلف انداز سے لکھا گیا ہے اور یہ ٹھیک نہیں۔ جس طرح بھی لکھا جائے، اُس کا تعیّن اور پھر اُس کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ ''مولانا'' کو اسی طرح لکھا جائے (کیوں کہ اب عموماً اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جاتا ہے) اور دوسرے لفظ کو ''اولنا'' لکھا جائے۔ یا پھر یہ کہ دونوں لفظوں کو ایک ہی طرح مولانا اور اولانا لکھا جائے (جس طرح عرشی صاحب نے اپنی عبارت میں لکھا ہے)۔ بہ ہر طور یہ مسئلہ مرتّب کے طے کرنے کا ہے۔

موئنہ: یہ ''موئینہ'' کا مخفف ہے (اِس کے معنی ہیں: پوستین)۔ ''موئنہ'' مرزا صاحب کے اِن شعروں میں آیا ہے:

ہے گلیمِ سیہِ بختِ پریشاں، کاکل   موئنہ بافتنِ ریشہ سنبل تاچند

(نسخۂ عرشی، ص ۳۹)

غالب کہ بقالیش باد، ہمپاے تو گرنباید   بارے غزلے، فردے زاں موئنہ پوش آور

(انتخابِ غالب، ص ۱۰۴)

جدید فارسی میں (''آینہ'' کی طرح) اِسے بھی ''مویِنہ'' لکھا گیا ہے (فرہنگِ فارسی) مگر کلاسکی اور ہندستانی فارسی میں ''موئینہ'' ملتا ہے (غیاث اللغات) اِسی نسبت سے اِس کا مخفف ''موئنہ'' ہوگا (''آئنہ'' کی طرح) اور عرشی صاحب نے دونوں شعروں میں (صحیح طور پر) ''موئنہ'' ہی لکھا ہے۔

مہینا: اِس لفظ کو مرزا صاحب نے ہر جگہ اسی طرح لکھا ہے۔ مثلاً: ''مہینا بھر میں نو پتے لکھتے ہیں'' (مکتوب بہ نامِ جنوں بریلوی۔ عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۳)۔ ''دعا گو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے'' (مکتوب بہ نامِ نواب ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۰۳)۔ ''مہینا ڈیڑھ ڈیڑھ مہینا اور چپکے ہو رہو'' (بہ نامِ علائی۔ عکس: فرستادۂ جناب کالی داس گپتا رضا)۔ ''میرے پاس ہر ہفتے کے آنے والے مہینا بھر سے نہیں آئے'' (مکتوب بہ نامِ تحسین مرزا۔ عکس:

علی گڑھ میگزین، غالب نمبر)۔ ''ﷲ روپیہ مہینا اُن کو کرایہ دیتا ہے'' (عکس: ایضاً)۔ ''پچاس روپے مہینا'' (بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۵۹)۔ ''رجب کا مہینا قرار پایا ہے'' (ایضاً، عکس: ایضاً، ص ۲۷۰)۔ ''رجب کا مہینا چلا'' (ایضاً۔ عکس: ایضاً، ص ۲۱۱)۔ ''یہ سو روپے مہینا'' (بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۸۰)۔

مَے: یہ دو حرفی لفظ ہے۔ اس میں میم پر زبر ہے اور آخر میں ے ساکن ہے۔ اس وزن کے اور اس قبیل کے جتنے لفظ ہیں، اُن سب کے آخر میں ے لکھی جاتی ہے۔ مرزا صاحب بھی اِس لفظ کا یہی املا مانتے تھے۔ اُن کی وہ غزل، جس کا مطلع ہے:

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　　نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے

اُس میں یہ شعر بھی ہے:

کیوں بوتے ہیں باغبان تُو بنے　　　گر باغ، گدائے مَے نہیں ہے

اِس غزل کے دوسرے قوافی ہیں: شَے، ہے، دَے، قَے، اَے۔ یہ سب لفظ بہ فتحِ اوّل ہیں، اِن کے ساتھ ''مَے'' کا ہم قافیہ ہونا اس وضاحت کے لیے کافی ہے کہ مرزا صاحب اِس لفظ کو بہ فتحِ میم مانتے تھے۔ اِن سب لفظوں میں یائے لین ہے، اُسے لازماً دراز صورت میں لکھا جائے گا۔ اِسے اگر یائے معروف (ی) کے ساتھ ''می'' لکھا جائے، تو اِس املا کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ ''می'' تو ویسا ہی ٹکڑا ہے، جو مثلاً ''آدمی'' میں آتا ہے۔

یہ وضاحت یوں کی گئی کہ نسخۂ عرشی میں اِسے اور سب جگہ ''می'' لکھا گیا ہے۔ اس غزل کے جس شعر میں یہ بہ طورِ قافیہ آیا ہے، وہاں تو ''مَے'' لکھا گیا ہے؛ مگر اِسی غزل کے ایک شعر میں یہ لفظ قافیے کے بجائے شروعِ مصرع میں آیا ہے، اور وہاں ''می'' لکھا ہوا ہے:

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد　　　مَی ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے (ص ۲۲۸)

یعنی ایک ہی غزل میں اِس لفظ کے دو املا ملتے ہیں: مے، می۔ یہ قطعی طور پر غیر مناسب ہے۔ نسخۂ عرشی میں اِس غزل کے قافیے کے ''مَے'' سے قطعِ نظر، اور ہر جگہ ''مَی'' لکھا گیا ہے۔ ''مَے'' کو ''مَی'' لکھنا جدید ایرانی طرزِ کتابت ہے۔ اِسے دیوانِ غالب میں جگہ نہیں

دینا چاہیے تھا۔ نسخۂ عرشی میں اِسے مفرد صورت میں اور جب اضافت کے ساتھ یہ بہ طورِ مضاف الیہ آئے، اِن دونوں صورتوں میں ''مَی'' لکھا گیا ہے، صرف دو تین مثالیں: موجِ مَی، لیک زسرتا قدم آغوشِ خمار (ص ۶) موجِ مَی پر ہے براتِ نگرانِ اُمید (ص ۳) رات کے وقت مَی پیے، ساتھ رقیب کو لیے (۱۷۸) مَی ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے (۲۲۸) صرفِ بہای مَی ہوئے آلاتِ میکشی (۲۲۹)۔

جب یہ لفظ بہ طورِ مضاف آیا ہے، تب اِس پر ہمزہ بھی لکھا گیا ہے، مثلاً: یہ مَئی تند نہیں موجِ خرامِ اظہار (ص ۳) مَئی تمثال پری، نشۂ مینا آزاد (ص ۷)۔

یہ دونوں طریقِ کتابت مناسب نہیں۔ اِس قبیل کے وہ سارے لفظ جو دو حرفی ہیں اور حرفِ اوّل مفتوح ہے، اُن کے آخر میں لازماً ے لکھی جانا چاہیے، خواہ وہ بہ طورِ مفرد آئیں، مثلاً: رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے؛ یا بہ طورِ مضاف الیہ آئیں، جیسے: صرفِ بہاے مے ہوئے آلاتِ مے کشی؛ یا بہ طورِ مضاف آئیں، جیسے: یہ مےِ تُند نہیں موجِ خرامِ اظہار؛ یا بہ طورِ معطوف آئیں، جیسے: جامِ سرشارِ مے وغنچۂ لب ریزِ بہار؛ سب صورتوں میں اِن کے آخر میں ے لکھی جائے گی؛ اور اضافت کی صورت میں اُس ے پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ اِس سلسلے میں مرزا صاحب کا قول موجود ہے کہ جس لفظ میں یاے تحتانی جزوِ لفظ ہو؛ اُس پر ہمزہ لکھنا، عقل کو گالی دینا ہے۔ ''مے'' میں بھی یاے تحتانی جزوِ لفظ ہے۔ بے، مے، نے، قے، لے، دَے، درپے، پیاپے، گے، پے، طے، اَے، شے: اِن سب کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ ''ہے'' خواہ فارسی کا ہو (جیسے: ہَے ہَے! خدانکردہ، تجھے بے وفا کہوں!؛ یا اردو کا ہو، جیسے: مہرِ گردوں، ہے چراغِ رہ گزارِ باد، یہاں؛ ہر صورت میں اِسی طرح (مع یاے دراز) لکھا جانا چاہیے۔

میرٹھ: عرشی صاحب نے مقدّمہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے کہ مرزا صاحب ''میرٹھ'' کو ''میرٹ'' لکھتے تھے (ص ۲۳۰)۔ میرے سامنے مرزا صاحب کی جس قدر دستی تحریریں (عکسی صورت میں) ہیں، اُن میں یہ لفظ دو جگہ ملتا ہے اور دونوں جگہ مرزا صاحب نے ''میرٹھہ'' (یعنی میرٹھ) لکھا ہے: ''میں نے اکبر آباد و فرّخ آباد و مارہرہ و میرٹھہ اپنے احباب کو لکھا ہے'' (مکتوب بہ نامِ حسین مرزا۔ عکس: (علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء)۔ ''تقلیب المکائد قلمی بہت

دن ہوئے کہ میں نے دیکھی ہے جب میرٹھ میں مفتی محمد قلی خاں مرحوم نے تصنیف کی تھی'' (مکتوب بہ نامِ مولانا عباس رفعت۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۳۷)۔

میں نے، مینے: مرزا صاحب کی (عکسی) تحریروں میں ''میں نے'' اور ''مینے'' دونوں املا ملتے ہیں، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ''میں نے'' بیش تر، ''مینے'' اُس کے مقابلے میں کم تر۔ مثلاً مکتوب بہ نامِ مولانا عباس رفعت (عکس مشمولہ غالب کے خطوط ص ۱۳۷) میں ''میں نے'' تین بار آیا ہے اور ''مینے'' ایک بار۔ یا جیسے مکاتیبِ غالب بہ نامِ نوابانِ رام پور کے حصے میں سے شروع کے پچاس خطوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اِن میں گیارہ جگہ ''میں نے'' ملتا ہے اور صرف ایک جگہ ''مینے'' (عکس مشمولہ مرقعِ غالب)۔

مینے اور میں نے، دو مختلف لفظ نہیں۔ ''میں نے'' کو جب بھی ملا کر لکھا جائے گا، تو ایک نون خود بہ خود ساقط ہو جائے گا، یعنی قلم سے نہیں نکلے گا۔ اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ''میں نے'' اصل کلمہ ہے؛ محض اِس وجہ سے کہ ملا کر لکھنے سے روانیِ قلم ذرا سی بڑھ جاتی ہے، اُس کی شکل ''مینے'' بن گئی۔ یہ وہی صورت ہے جو ''مجھ کو'' اور ''مجکو'' کی ہے۔ ''میں نے'' اصل کلمہ ہے اور اِسے ہر جگہ اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ (لکھا بھی گیا ہے اِسی طرح)۔

ناشتا: اصلاً اِس کے آخر میں الف ہے؛ لیکن غلط العوام کے نتیجے میں اِسے ''ناشتہ'' بھی لکھا جانے لگا ہے۔ اِس کی سب سے دل چسپ مثال ادبی خطوطِ غالب (مرتبہ مرزا محمد عسکری) میں ملتی ہے۔ مرتب نے مرزا صاحب کے ایک مکتوب بہ نامِ تفتہ کی یہ عبارت نقل کی ہے:

> ''ع: روح را ناشتا فرستادی، یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا۔
> ''ناشتا'' اُس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اُس کی نہار منہ۔ تم لکھتے ہو: اے عجب ناشتا فرستادی۔ یعنی غذاے صبح، جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: اُس نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں'' (ص ۱۰۰)۔

ا۔ خطوطِ غالب میں مصرع یوں ہے: کہ عجب ناشتا فرستادی (ص ۹۹)۔

کاتب صاحب نے آخری سطر میں ''ناشتا'' کو ''ناشتہ'' بنادیا اور مصحح یا مرتب نے اِس کی اصلاح ضروری نہیں سمجھی۔ تفتہ کے نام کا یہ خط خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد میں شامل ہے اور اُس میں اِس آخری سطر میں ''ناشتا'' ہے (اور یہی ہونا چاہیے)۔

ناو: یہ تین حرفی لفظ ہے (ن ـ ا ـ و)۔ ''راو'' اور ''لگاو'' کے ذیل میں ایسے لفظوں میں شامل آخری واو پر ہمزہ نہ لکھنے کی بحث آچکی ہے۔ ''ناو'' بھی اُسی انداز اور قماش کا ہے، اِس میں بھی واو موقوف ہے (نَ ـ اَ ـ وْ)۔ اِس میں، اور اِس جیسے لفظوں میں واوِ موقوف کی آواز اسی طرح خفی ہو کر شاملِ تلفظ ہوتی ہے، جیسے مثلاً جنیو اور دیو میں شاملِ تلفظ ہوتی ہے۔ جس طرح ''جنیؤ'' یا ''دیؤ'' نہیں لکھا جاتا، اُسی طرح ''راؤ''، ''لگاؤ'' اور ''ناؤ'' بھی نہیں لکھیں گے۔ نسخۂ عرشی میں اِسے مع ہمزہ لکھا گیا ہے:

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی ورنہ، کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

(ص ۲۸۷)

''ناؤ'' کو معِ ہمزہ لکھا گیا ہے اور ''لائے'' کو بغیرِ ہمزہ۔ حالاں کہ برعکس ہونا چاہیے تھا، یعنی ''لائے'' معِ ہمزہ اور ''ناو'' بغیرِ ہمزہ۔ (لائے، لاوے کی بدلی ہوئی شکل ہے، واو کی جگہ ہمزہ نے لے لی ہے)۔

نژاد: مرزا صاحب نے اِسی طرح لکھا ہے (اور ہے بھی اِسی طرح):

رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

(عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۸۱)۔

یہ وضاحت یوں کی گئی کہ بعض لوگ (لاعلمی کی وجہ سے) اِسے ''نزاد'' بھی لکھ دیتے ہیں۔

نشہ: عرشی صاحب نے رضا لائبریری رام پور کے ایک اہم خطی نسخہ دیوانِ غالب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''نشہ کو عموماً بہ تشدیدِ شین لکھا ہے، اور جہاں کاتب سے تشدید رہ گئی تھی، وہاں میرزا صاحب نے اپنے قلم سے بڑھائی ہے''

(مقدمہ نسخۂ عرشی، ص ۹۰)

اِس صورت میں یہ مناسب ہوگا، بلکہ ضروری ہوگا کہ وزنِ شعر کی مناسبت سے تشدید ضرور لگائی جائے۔ نسخۂ عرشی میں اِس لفظ پر تشدید کہیں نہیں ملتی، بعض مثالیں:

ہوں ز پا اُفتادۂ اندازِ یادِ حُسنِ سبز کس قدر ہے نشئہ فرسائے خمارِ بنگ، دل

(ص ۵۳)

نشئے میں گم کردہ رہ آیا، وہ مستِ فتنہ خو آج رنگِ رفتہ، دورِ گردشِ ساغر ہوا

(ص ۲۰)

اے بہ ضبطِ حال خونا کردگاں، جوشِ جنوں نشئۂ مے ہے، اگر یک پردہ نازکتر ہوا

(ص ۲۰)

حسرتِ نشئۂ وحشت نہ بسعیِ دل ہے عرضِ خمیازۂ مجنوں ہے گریباں میرا

(ص ۲۱)

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے نشئہ، باندازۂ خمار نہیں ہے (ص ۲۰۸)

(نسخۂ لاہور میں مصرع یوں ہے: نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے، ص ۹۷)۔

''نشئۂ وحشت''، ''نشئۂ مَے'' اور ''نشئہ فرسا'' کو نشّۂ وحشت، نشّۂ مے اور نشّہ فرسا لکھا جانا چاہیے تھا؛ اِس بنا پر کہ خود مرزا صاحب نے اِس طرح لکھنے کی ہدایت کی ہے، اِس طور پر کہ اپنے قلم سے تشدید لگائی ہے۔

نقشا: عرشی صاحب نے دیباچہ مکاتیبِ غالب میں ''املائے غالب'' کے تحت لکھا ہے: ''نقشا کو، باوجود مہنّد ہونے کے، ہ سے لکھا ہے'' (ص ۲۲۷)۔ معلوم نہیں اِس قول کی بنیاد کیا ہے؛ کیوں کہ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ''نقشا'' ملتا ہے: ''وہ نقشا پسنداروں کا جو یہاں سے صدر کو گیا تھا'' (مکتوب بہ نامِ ناظم، عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۹۸)۔ ''ناچار اپنا نقشا اُتروایا اور خدمتِ عالی

میں روانہ کیا'' (مکتوب بہ نام نواب کلبِ علی خاں، عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۷۶)۔ ''جو نقشا سری مہاراج کے پسند آئے'' (عکس: غالب کے خطوط، ص ۷۵۰)۔

اور خود عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں ''نقشا'' ہی لکھا ہے:

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشا تیرے جلوے نے

کرے جو، پرتوِ خرشید، عالم شبنمستاں کا (ص ۱۵۶)

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے، بہشت یہی نقشا ہے، ولے اِس قدر آباد نہیں (ص ۱۸۶)

مرزا صاحب کے طریقِ کتابت کے مطابق اِسے ''نقشا'' لکھا جانا چاہیے۔ (فارسی میں ''نقشہ'' ہے (فرہنگِ فارسی)۔

نمایش گاہ: ''آرایش'' کے تحت یہ تفصیل آچکی ہے کہ نمایش، آرایش جیسے حاصل مصدروں میں لازماً ی لکھی جائے گی۔ اِسی طرح اُن لفظوں میں بھی ی آئے گی، جو ایسے حاصل مصدروں سے بنے ہوں گے۔ اِس اصول کی بنا پر ''نمایش گاہ'' میں بھی ش سے پہلے ی برقرار رہے گی۔ مرزا صاحب نے خود بھی اِسی طرح لکھا ہے:

نمایشگہے در خورِ شانِ خوش بر آراست نوابِ عالی جناب

(عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۶۷)

'نمایش گاہِ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں۔ خود اس نمایشگاہ کی سیر سے، جس کو دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا'' (عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۸)۔ ''نمایش گاہِ سراسر سوِرام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۶۷)۔

نے: اِس کے معنی ہیں: نہیں۔ اِسے ''نہ'' کی محرف صورت سمجھ لیجیے۔ اِس کے آخر میں یاے مجہول (ے) ہے اور نون کے نیچے زیر ہے (غیاث اللغات، برہانِ قاطع، فرہنگِ فارسی)۔ صرف برہانِ قاطع کی عبارت نقل کی جاتی ہے:

''نے: بہ فتحِ اوّل وسکونِ ثانی، مخفف ''نائے'' است کہ مزمار و حلقوم باشد۔ وقلم وکلک ونیشکر را نیز گویند۔ و بہ کسرِ اوّل: افادۂ لائے نفی کند''۔

یہ وضاحت کہ ''نَے'' بانسری کے معنی میں بہ فتحِ اوّل ہے اور نہیں کے معنی میں ''نِے'' بہ کسرِ اوّل ہے، یوں خاص کر کی گئی کہ نسخۂ عرشی میں اِس کو ''نے'' اور ''نَی'' دونوں طرح لکھا گیا ہے اور کئی جگہ نون پر زبر ملتا ہے:

نَی مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال — مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے (ص ۲۳۰)

یا صبحدم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں — نَی وہ سرور وسور، نہ جوش وخروش ہے (ص ۲۳۰)

نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ — میں معرضِ مثال میں دستِ بُریدہ ہوں (۲۹۹)

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ — نے دانۂ فتادہ ہوں، نے دامِ چیدہ ہوں (۲۹۹)

ضعف سے ہے، نَی قناعت سے یہ ترکِ جستجو — ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم (۱۷۷)

نَے صبا بالِ پری، نَے شعلہ سامانِ وجود — شمع سے بجز عرضِ افسونِ گدازِ دل نہ پوچھ (۷۲)

نَے سرو برگِ آرزو، نَے رہ و رسمِ گفتگو

اے دل وجانِ خلق، تو ہم کو بھی آشنا سمجھ (۷۳)

ضعف سے ہے، نَے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو

ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم (۱۷۷)

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نَی بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے (۲۰۶)

یہ وضاحت پھر کی جاتی ہے کہ بانسری کے معنی میں ''نَے'' اور نہیں کے معنی میں ''نِے'' لکھا جانا چاہیے اور اِن دونوں لفظوں کو ''نَی'' کسی بھی صورت میں نہیں لکھا جانا چاہیے۔ (اِس سلسلے میں مزید دیکھیے: مَے)۔

وائے: وائے اور ہائے، اِن دونوں لفظوں میں ''ے'' موقوف ہے (یعنی ''ے'' سے پہلے الف ساکن ہے) اِن دونوں لفظوں میں (ایسے اور الفاظ کی طرح) ''ے'' جزوِ لفظ ہے؛ اِس بنا پر، مرزا

غالبؔ کے قول کے مطابق (اور قاعدے کے لحاظ سے بھی) ے پر ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔ نسخۂ عرشی میں "واے" ہر جگہ ہمزہ کے بغیر ہی ملتا ہے (اور یہی صحیح املا ہے)، مثلاً:

واے دیوانگیِ شوق، کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا
(ص ۱۵۰)

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
واے ناکامی، کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے (۲۱۳)

واے، واں بھی شورِ محشر نے نہ لینے دم یا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے (۲۳۲)

واے، گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا (۱۵۰)

وھاں، یھاں: نوّاب یوسف علی خاں ناظم کا شعر تھا:

سیّاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے یہاں بھی　　کچھ تیرے پجاری تو نہیں اے بُتِ چیں ہم

مرزا صاحب نے اصلاح دیتے ہوئے دوسرے مصرعے کو اِس طرح بنا دیا: "سیّاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے ہیں یھاں بھی" اور اِس کی وضاحت اِس طرح کی: "یہاں" بروزنِ "دہاں" فصیح نہیں، بے ضرورت نہ چاہیے۔ "یھاں" بہ ہاے مخلط التلفظ افصح ہے" (مقدمہ مکاتیب غالب، ص ۱۵۴)۔ ناظمؔ کا ایک اور شعر تھا:

تم آتو جاؤ صومعے میں ایک دن، کہ ہیں　　اپنے کو دور مردمِ دیں دار کھینچتے
مرزا صاحب نے پہلے مصرع کو اِس طرح بنا دیا: "تم آتو جاؤ صومعے میں ایک دن، کہ وھاں"
(ایضاً، ۱۵۵)

اِن اصلاحوں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ مرزا صاحب "یہاں" اور "وہاں" کے مخفف کو "یھاں" اور "وھاں" لکھتے تھے اور اِن کو "افصح" (فصیح تر) مانتے تھے۔ اِس صورت میں مرزا صاحب کے کلام میں یہاں اور وہاں کے مخفف کو "یھاں" اور "وھاں" لکھا جانا چاہیے تھا؛ مگر ایسا نہیں ہوسکا اور اِن کی جگہ "واں" اور "یاں" لکھے جانے لگے۔ اِس کا باقاعدہ آغاز

انتخابِ غالب سے ہوتا ہے، جسے عرشی صاحب نے مرتب کیا تھا اور ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس میں عرشی صاحب نے یہ لکھا کہ اِس کے مسوّدے میں مرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''وھاں'' کو ''واں'' بنایا ہے (ص ۱۴۱)۔

عرشی صاحب نے مرزا صاحب کی جس اصلاح کا حوالہ دیا ہے، اگر واقعتاً وہ اصلاح مرزا صاحب کی ہوتی، تو اُس مسوّدے میں جہاں جہاں ''وھاں'' تھا، اُسے ''واں'' بنایا جاتا؛ مگر ایسا نہیں۔ میں نے جو شمار کیا تو انتخابِ غالب میں ایسے بیس مصرعے ہیں، جن میں ''یاں'' اور ''واں'' چھپے ہوئے ہیں۔ عرشی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح صرف ایک جگہ کی گئی ہے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ بیس جگہ وھاں اور یھاں لکھے ہوئے ہوں، اور اصلاح صرف ایک جگہ کی جائے۔ معلوم نہیں یہ اصلاح کس کے قلم کی ہے۔ ایک لفظ سے کسی کا خط پہچان لینا ناممکن نہ ہو، مشکل تر ضرور ہے۔ اگر مرزا صاحب نے وہ اصلاح کی ہوتی، تو کسی اور جگہ بھی تو ''وھاں'' یا ''یھاں'' کو واں اور یاں بناتے۔ ایسا نہیں ہوا؛ پھر یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ وہ اصلاح مرزا صاحب کے قلم کی ہے۔

اِس سلسلے میں تین ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا صاحب شروع سے آخر تک ''یھاں'' اور ''وھاں'' لکھتے رہے اور اِنھی کو فصیح مانتے رہے۔ پہلی شہادت تو ناظم کے کلام پر اصلاح کی صورت میں ہے، جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔ ناظم نے فروری ۱۸۵۷ء میں مرزا صاحب سے کلام پر اصلاح لینا شروع کی تھی اور ۱۸۶۳ء تک یہ سلسلۂ اصلاح جاری رہا (مقدّمہ مکاتیبِ غالب، ص ۳۸۔ ص ۸۷)۔ ناظم کا دیوان پہلی بار بہ قولِ عرشی صاحب ۱۲۷۸ھ میں چھپا تھا (۶۲۔۱۸۶۱ء) جو صرف مرزا صاحب کے اصلاحی کلام پر مشتمل تھا (ایضاً، ص ۴۴)۔ اِس طرح یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ۶۲۔۱۸۶۱ء تک مرزا صاحب ''وھاں'' اور ''یھاں'' کو ''فصیح'' مانتے رہے۔

دوسری شہادت صاحب زادہ عباس علی خاں بیتابؔ رام پوری کے کلام پر مرزا صاحب کی اصلاح کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ حُسنِ اتفاق سے اِس کی تاریخ بھی معلوم ہے۔

کلامِ بیتابؔ کے جن اوراق پر مرزا صاحب نے اصلاح دی ہے، اُن پر تاریخ موجود ہے: ''مرقومہ ۱۵رنومبر ۱۸۶۶ء'' (مکاتیبِ غالب، ص۹۵)۔ بیتابؔ کا شعر تھا:

ہو یہ حیرت، میں یہیں تھا کہ زمیں پر اللہ

عرش کی سیر کا راکب کو گر آ جائے خیال

مرزا صاحب نے پہلے مصرعے کو اِس طرح بنایا: ''ہو یہ حیرت کہ میں یہاں تھا کہ زمیں پر اللہ'' (ایضاً، ص۱۰۶)۔ یعنی مرزا صاحب نے ''یہاں'' (معِ ہائے مخلوط التلفظ) کا اضافہ کیا۔ بیتابؔ کا شعر تھا:

اک ذرا سی اور بھی تاخیر کرنا اے اجل　　سنتے ہیں کچھ وھاں اپنے قتل کی تدبیر ہے

مرزا صاحب نے ''اپنے'' کی جگہ ''ہمارے'' بنادیا، یعنی ''وھاں'' کو برقرار رکھا (ایضاً، ص۹۵) اِس طرح وزن کو درست کر دیا۔ بیتابؔ کا شعر تھا:

دیر دیکھا، مے کدہ دیکھا، حرم بھی دیکھ لیں　　آج آنکلے ہیں یھاں بھی گردشِ ایام سے

مرزا صاحب نے دوسرے مصرعے میں ''بھی'' کو ''ہم'' سے بدل دیا: آج آنکلے ہیں یھاں ہم گردشِ ایام سے۔ یعنی ''یھاں'' کو برقرار رکھا۔ اِن اصلاحوں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مرزا صاحب ۱۸۶۶ء تک (مرنے سے کم و بیش تین سال پہلے تک) ''وھاں'' اور ''یھاں'' ہی کو درست سمجھتے تھے۔

تیسری شہادت: ۵رجب ۱۲۸۴ھ (۲رنومبر ۱۸۶۷ء) کو مرزا صاحب نے نوّاب کلبِ علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے: ''ایک قطعہ پندرہ شعر کا بھیجتا ہوں''۔ یہ خط معِ قطعہ مکاتیبِ غالب میں ہے اور اِس کا عکس مرقعِ غالب میں شامل ہے۔ اِس کے دو شعروں میں ''یھاں'' (معِ ہائے مخلوط) آیا ہے (لفظِ ''خوّرم'' کے ذیل میں اِس قطعے کا حوالہ آچکا ہے)۔ شعر یہ ہیں:

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں　　ہے اِسی طور پہ یھاں دجلہ فشاں دستِ کرم

مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس　　خضر بھی یھاں اگر آجائے،تو لے اُن کے قدم

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب میں اِن شعروں میں دونوں جگہ ''یھاں'' (معِ ہائے مخلوط) ہی لکھا ہے۔ یہاں اُنھوں نے مرزا صاحب کے املا کی پابندی کی ہے۔ مرزا صاحب کی یہ تحریر بیتاب کے کلام پر اصلاح کے تقریباً سال بھر بعد کی ہے۔ اِن اصلاحوں سے اور مرزا صاحب کے قلم کی اس تحریر سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مرزا صاحب آخرِ عمر تک اِن لفظوں کو اسی طرح لکھتے رہے۔ یہ خیال کہ مرزا صاحب نے آخر میں ''وھاں'' کی جگہ ''واں'' کو اور ''یھاں'' کی جگہ ''یاں'' کو مرجح مان لیا تھا، قابلِ قبول نہیں۔

اِن شہادتوں کے بعد ایک ضمنی حوالہ بھی پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اِس حوالے کی اہمیت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ایسے متعدد شعر درج کیے ہیں جن میں اِن دونوں زیرِ بحث لفظوں میں سے کوئی لفظ آیا ہے۔ یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ یادگارِ غالب پہلی بار مولانا حالی کی نگرانی میں چھپی تھی۔ ایسے اشعار کے متعلقہ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں: یھاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں (یادگارِ غالب، طبع اوّل، نامی پریس کانپور۔ سالِ طبع ۱۸۹۷ء، ص ۱۵۰)۔ یھاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں (ص ۱۵۰) یھاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا (۱۳۹) وھاں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب (ص ۱۵۲) اُس کی بزم آرائیاں سُن کر، دلِ رنجور یھاں (ص ۱۳۷) یھاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی (۱۶۱) یھاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے (ص ۱۳۷) مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد یھاں (ص ۱۲۷)۔ حالی، جو کلامِ غالب سے، زبانِ غالب سے اور غالب کی تحریروں سے قریب کی واقفیت رکھتے تھے، اُنھوں نے صحیح طور پر اور منشاے غالب کے مطابق کلامِ غالب میں ''وھاں'' اور ''یھاں'' کو جگہ دی، کسی ایک جگہ ''واں'' اور ''یاں'' نہیں لکھا۔

اِس بحث سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کلامِ غالب میں لازمی طور پر ''وھاں'' اور ''یھاں'' لکھے جائیں گے۔ اگر اِن کی جگہ ''یاں'' اور ''واں'' لکھے جائیں گے، تو اِن شکلوں کو

۱۔ اردو کی ہکار آوازوں میں ''دھ'' اور ''یھ'' بھی شامل ہیں (جن کو اب لوگ بھولتے جا رہے ہیں)۔ سید انشا نے دریاے لطافت میں اِن کی نشان دہی کی ہے (ترجمہ دریاے لطافت، ص ۱۰)۔ اِن ہکار آوازوں کی مثال کے تحت اُنھوں نے لکھا ہے: ''واو اور ی کے اختلاط کی مثال ہے یھاں اور وھاں'' (ص ۱۳)۔ دہلی میں

منشاے مصنف اور املاے مصنف کے خلاف سمجھا جائے گا۔

ہاں ایک بات اور: لاہور سے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے دیوانِ غالب نسخۂ لاہور کا جو عکسی اڈیشن شائع کیا ہے، اُس میں ہر جگہ یہ دونوں لفظ ہ کے ساتھ ہی مرقوم ہیں، کسی ایک جگہ ہ کے بغیر مرقوم نہیں۔ البتہ ہر عکسی صفحے کے مقابل جو کتابت شدہ صفحہ شامل کیا گیا ہے، اُس میں ہر جگہ یہ دونوں لفظ ہ کے بغیر ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صحیح طریقۂ کار نہیں۔

ہاتی (ہاتھی): مرزا صاحب کی جو دستی تحریریں (عکسی) میرے سامنے ہیں، اُن میں یہ لفظ مجھے ایک جگہ ملا۔ ''خانِ موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگِ ناگاہ ہاتی سے گر کے مر گیا'' (خود نوشت حالات۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۹۷)۔ نسخۂ عرشی میں قادرنامے کا مصرع ہے: چیونٹی ہے مور اور ہاتھی ہے پیل (ص ۲۷۰)۔ املا کا یہ اختلاف مناسب نہیں۔

ہاتھ (ہات): ''یہ لفظ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں بار ہا آیا ہے اور اُنھوں نے بیش تر ''ہات'' لکھا ہے۔ اِس لفظ کے تحت زیادہ حوالے پیش کرنے کی یوں ضرورت نہیں کہ یہ لفظ اِسی طرح بہت سے مقامات پر ملتا ہے اِس لیے بس دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں؛ جن میں سے ایک

عہدِ غالب تک، بلکہ ذرا بعد تک یہ دونوں آوازیں شاملِ تلفظ رہی ہیں۔ مثلاً دیوانِ حالی میں اِن دونوں لفظوں کی یہ صورتیں ملیں گی۔ حالی کا دیوان پہلی بار اُنھی کی نگرانی میں مطبعِ انصاری دہلی میں ۱۸۹۳ء میں چھپا تھا۔ میں صرف دو مصرعے نقل کرتا ہوں: آن کر آزاد یھاں آزاد رہ سکتا نہیں (ص ۲۵) جوانِ خام کی وھاں تک نہیں پہنچتی نگاہ (ص ۲۴)۔ یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ مولانا حالی نے یادگارِ غالب اور دیوانِ حالی، دونوں میں اِن لفظوں میں دوچشمی (ھ) لکھی ہے۔

۱۔ وھاں اور یھاں سے متعلق سب سے پہلے میں نے تبصرۂ دیوانِ غالب صدی اڈیشن (مرتبۂ مالک رام) میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ یہ تبصرہ میری کتاب ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ میں شامل ہے۔ اُس کے بعد ایک مستقل مضمون اِس سلسلے میں لکھا تھا، جس میں ضروری تفصیلات کو یک جا کر دیا گیا تھا۔ یہ مفصل مضمون ''تدوینِ کلامِ غالب کے مسائل املا کے لحاظ سے'' میری کتاب تدوین۔ تحقیق۔ روایت میں شامل ہے۔

۲۔ دیوانِ غالب میں ایک جگہ یہ بات اور اوقات (وغیرہ) کے قافیے میں بھی آیا ہے: نصرت الملک بہادر، مجھے بتلا کہ مجھے = تجھ سے جو اِتنی ارادت ہے، تو کس بات سے ہے = خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست = نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے (نسخۂ عرشی، ص ۱۲۸)۔

شعر ہے، جس میں یہ لفظ دو بار آیا ہے۔ نوّاب علاء الدّین احمد خاں علائی کے نام خط میں مرزا صاحب نے اپنی وہ غزل بھی لکھی ہے، جس کا مطلع ہے:

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

اِس غزل کے اِس شعر میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے:

اِس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہات آئیں، تو اُنھیں ہات لگائے نہ بنے

(عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۹۰)۔ نوّاب کلبِ علی خاں کے نام ایک خط مارچ ۱۸۶۷ء کا ہے، اُس میں بھی یہ لفظ آیا ہے: ''آج یہ قطعہ ہات تمام کر لکھ کر حضور کی نذر بھیجتا ہوں'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۶۵)۔ لیکن اِس کے اگلے سال ۱۶ر نومبر ۱۸۶۸ء کو نوّاب کلبِ علی خاں کے نام خط میں مرزا صاحب نے ''ہاتھہ'' لکھا ہے: ''مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھہ ہے'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۸۱)۔ اور اِس سے تقریباً دو سال پہلے، ۱۸ر ستمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں مرزا صاحب نے ''ہاتھہ'' لکھا ہے۔ یہ خط بھی نوّاب کلبِ علی خاں کے نام ہے: ''بصارت میں فتور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۶۲)۔ یعنی ۱۸ر ستمبر سے ۱۶ر نومبر ۱۸۶۸ء تک دو سوا دو برس کے آخری زمانے میں نوّاب کلبِ علی خاں کے نام کے تین خطوں میں یہ لفظ آیا ہے، دو خطوں میں ''ہاتھہ'' (یعنی ہاتھ) ہے اور ایک خط میں ''ہات''۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ مرزا صاحب کی ایسی آخری تحریر، جس میں یہ لفظ آیا ہو، ۱۶ر نومبر ۱۸۶۸ء کا محوّلہ بالا خط ہے۔ اُس کے بعد کی کسی دستی تحریر میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو اِس لفظ کا املا ''ہاتھ'' مرجّح قرار پائے گا، یوں کہ یہ اُن کے قلم کا آخری نقش ہے اِس لفظ کی صورت میں اور اس لفظ کی حد تک۔

اِس سلسلے میں ایک اور اندراج کو بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔ عرشی صاحب نے مقدمہ مکاتیبِ غالب میں املاے غالب کے ذیل میں لکھا ہے: ''ہاتھ کو بھی خود ''ہات'' لکھتے

تھے، مگر ناظم کے مصرعوں: ہات سے رضواں کے چھوٹا شانہ زلفِ حور میں، اور ع: ہاتھ میں خط لیا کہ دم نکلا، میں کاتب نے "ہات" اور "ہاتھ" لکھا تھا؛ اِن دونوں شکلوں کو "ہاتھ" میں تبدیل کر دیا ہے" (ص ۲۳۰)۔

اِس عبارت میں یہ جملہ: "ہاتھ کو بھی خود ہات لکھتے تھے" ترمیم طلب ہے۔ اوپر جو حوالے پیش کیے گئے ہیں، اُن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے اِس لفظ کو دونوں طرح لکھا ہے: "ہات" اور "ہاتھ"۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بیش تر "ہات" لکھا ہے؛ مگر اُن کی آخری دستی تحریر، جس میں یہ لفظ آیا ہے، مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں ہے اُس میں اُنھوں نے "ہاتہ" لکھا ہے۔

مرزا صاحب نے دو خطوں میں اپنے قلم سے "ہاتہ" (یعنی ہاتھ) لکھا ہے؛ اِس بنا پر کلامِ غالب میں "ہاتھ" کو مرجّح املا مانا جاسکتا ہے تین وجہوں سے: ایک تو یہ کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے "ہاتھ" بھی لکھا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن کے قلم نے آخری بار "ہاتھ" لکھا ہے۔ اور تیسری بات، جس کی حیثیت ویسے ضمنی ہے، یہ ہے کہ صحیح املا بھی یہی ہے اور رائج املا بھی یہی ہے۔

ہاردنگ: "گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں لمبر اور سات پارچے.... خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہاردنگ صاحب کے عہد تک پایا" (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۸)۔

ہاے، ہاہاے: مرزا صاحب نے ایک خط میں یہ وضاحت کی ہے کہ جن لفظوں میں ے جزوِ کلمہ ہے، اُس ے پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے۔ تفتہ کے نام خط میں لکھا ہے:

> "یاد رکھو، یاے تحتانی تین طرح پر ہے: جزوِ کلمہ، ہماے بر سرِ مرغاں ازاں شرف دارد، اے سرنامہ نامِ تو عقلِ گرہ کشاے را؛ یہ ساری غزل، اور مثل اِس کے جہاں یاے تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے؛ اُس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے...." خطوطِ غالب، ص ۲۳)۔

''ہاے'' میں بھی ے جزِ لفظ ہے، اِس لیے مرزا صاحب کی وضاحت کے مطابق ''ہاے'' لکھا جائے گا، ''ہائے'' نہیں لکھا جائے گا۔ اِسی طرح ''ہاے ہاے''۔

دیوانِ غالب میں ایک قطعے کی ردیف ''ہاے ہاے'' ہے اور یہی ردیف ایک غزل کی ہے۔ نسخہ عرشی میں ان دونوں ردیفوں کو ''ہائہاے'' لکھا گیا ہے؛ یعنی ایک جز ''ہاء'' اور دوسرا جز ''ہاے''؛ قطعے کا پہلا شعر یہ ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائہاے

(نسخہ عرشی، ص ۱۲۳)

اور غزل کا مطلع ہے:

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری، ہائہاے!

کیا ہوئی ظالم، تری غفلت شعاری، ہائہاے

(ایضاً، ص ۲۰۴)

اصل لفظ ''ہاے'' ہے۔ ''ہاے ہاے'' کو خواہ منفصل لکھا جائے، یا ملا کر؛ رہیں گے تو دونوں جز وہی ''ہاے''؛ پھر ایک جز میں ے کی جگہ ہمزہ لکھنا (ہائہاے) کیسے قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔ نسخہ کالی داس گپتا رضا میں مذکورہ قطعے اور غزل، دونوں کی ردیف ''ہاے ہاے'' ہے (دونوں جز منفصل۔ ص ۲۹۸، ص ۳۷۹) یہی صحیح صورت ہے اور اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ ''ہاے'' اور ''ہاے ہاے'' میں ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائے گا، کیوں کہ مرزا صاحب کا واضح قول موجود ہے۔ مرزا صاحب کے اِس معروف شعر میں بھی ''ہاے'' آیا ہے اور نسخہ عرشی میں اسے ہمزہ کے بغیر لکھا گیا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہای اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (ص ۱۰۵)

یہاں ''ہای'' ہمزہ کے بغیر ہے اور درست ہے (بس اِتنی بات ضرور ہے کہ اسے ''ہاے'' لکھا جانا چاہیے تھا)۔ اِسی طرح انتخابِ غالب کے اِس شعر میں بھی ''ہای ہای'' ہمزہ کے بغیر ہے:

۱۔ نسخہ لاہور کے کاتب نے ''ہایہاے'' لکھا ہے (ص ۱۶۷)۔

''دل، تابِ ضبطِ نالہ ندارد، خدای را

از ماجوی گریۂ بی ہای ہای را''(ص۲۱)

(یہاں بھی بس وہی بات ہے کہ ''خدائے''، ''مجوئے''اور''بے ہاے ہاے'' ہونا چاہیے تھا)۔

اِس سلسلے کی دل چسپ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے دو جگہ ''ہاے'' لکھا ہے اور ایک جگہ ''ہائے ہائے'': ''نمایش گاہِ سراسر سوررام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہاے میں وہاں نہیں'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۶۷) ''سروِ چمنِ سروری اُفتاد زپا، ہاے'' (ایضاً، ص ۲۸۷)۔

لیکن ایک جگہ ''ہائے ہائے'' لکھا ہے: ''کسی شب کو کچھ سو رہتا ہے، ورنہ ساری رات جاگتا اور ہائے ہائے کرتا ہے'' (ایضاً، ص ۲۵۲)۔

چوں کہ مرزا صاحب نے واضح طور پر، اور خاص کر ایک قاعدے کے طور پر یہ لکھا ہے کہ جن لفظوں میں ے جزوِ لفظ ہوگی، اُس ے پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ یہی نہیں، ایسی ے پر ہمزہ لکھنے کو، عقل کو گالی دینا کہا ہے؛ اِس بنا پر، اُن کے قول اور اُن کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق لازماً ''ہاے ہاے'' لکھا جائے گا اور اُن کے لکھے ہوئے ''ہائے ہائے'' کو سہوِ قلم مانا جائے گا۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں سہوِ قلم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، ایسی مثالوں کو بنیاد بنا کر کسی لفظ کے املا کا تعین نہیں کیا جاتا، اُنھیں لغزشِ قلم ہی کہا جاتا ہے؛ اِس لیے یہاں بھی اِس ''ہائے ہائے'' کو لغزشِ قلم مانا جائے گا۔

ہر آئنہ، ہر آئینہ: دیکھیے ''آئینہ''۔

ہندستان، ہندوستان: اِس لفظ کے املا میں مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں دورنگی پائی جاتی ہے۔ جنوں بریلوی کے نام خط میں لکھا ہے: ''فی الحال دودمانِ معنی کا وہ حال ہے جو ہندستان کا غدر کے بعد ہوگیا تھا'' (عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۵۱۰)۔ مولوی نعمان احمد کے نام خط

میں بھی ''ہندستان'' واو کے بغیر لکھا ہے: ''زحل و مریخ سرطان میں فراہم ہوئے تھے، سراسر ہندستان کی خاک اُڑا دی'' (ایضاً، ص ۱۴۵۳)۔ لیکن نواب ناظم کے نام خط میں ''ہندوستان'' لکھا ہے: ''یہاں اشتہارِ عام ہوگیا ہے کہ قلمروِ ہندوستان میں عملِ ملکۂ معظمہ عالی مقام ہوگیا ہے'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۴)۔ نامہ ہای فارسیِ غالب میں شامل ایک عرضی میں ''ہندوستان'' لکھا ہے (یہ عرضی بہ خطِ غالب ہے): ''در دہلی و کلکتہ و جمیع بلادِ ہندوستان ہماں یک حکمِ سرکارِ دولتمدار است'' (عکس ص ۱۱۶ کے مقابل، فرستادۂ ڈاکٹر حنیف نقوی)۔ دیوانِ اُردو میں بہ اظہارِ واو (یا یوں کہیے کہ بہ اشباعِ واو) ملتا ہے:

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے — جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
(نسخۂ عرشی، ص ۲۶۳)

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں — فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے
(نسخۂ عرشی، ص ۲۰۳)

ہندوستان سایۂ گل، پائے تخت تھا — جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
(نسخۂ عرشی، ص ۷۰)

نظم میں کوئی لفظ اگر بہ اشباع آئے، تو وہ عموماً ضرورتِ شعری کا تقاضا ہوتا ہے، اُس سے اصل املائی صورت کا تعین کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ چوں کہ مرزا صاحب کی نثری (دستی) تحریروں میں یہ لفظ دو طرح ملتا ہے (ہندستان۔ ہندوستان) اِس صورت میں کسی ایک املائی صورت کو مرجح مان کر، مرتب اُسی املائی شکل کو اختیار کرسکتا ہے۔ اصل کی رعایت کو اگر ملحوظ رکھا جائے، تو ''ہندوستان'' کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔ بہ ہرصورت، اِس کا تعلق مرتب کی صواب دید سے رہے گا۔

ہُنڈوی: مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے جو عکس پیشِ نظر ہیں، اُن میں یہ لفظ اِسی طرح ملتا ہے۔ دو حوالے کافی ہوں گے: ''خط مع ہنڈوی کے پہنچا'' (مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۱۳)۔ ''ڈھائی سو روپے کی ہنڈوی معتمد کے حوالے کی گئی'' (ایضاً، ص ۲۱۹)۔ ہُنڈی اور ہنڈوی، یہ لفظ دونوں طرح درست ہے (فرہنگِ آصفیہ)۔ چوں

کہ مرزا صاحب نے ''ہنڈوی'' ہی لکھا ہے، اِس بنا پر اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔

یونہی: صاحب زادہ عباس علی خاں بیتاب رام پوری کا شعر تھا:

بوسہ ملا، تو اب یہ ہوس ہے کہ عُمر بھر
یونہیں ملائے رکھیے دہن کو دہن کے ساتھ

مرزا صاحب نے ''یونہیں'' کو قلم زد کرکے، اُس کی جگہ ''یونہی'' لکھ دیا (مکاتیبِ غالب، ص ۹۴)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مرزا صاحب ''یونہی'' کو درست سمجھتے تھے، اِس بنا پر کلامِ غالب میں اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے۔ عرشی صاحب نے اِسی طرح لکھا ہے:

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسد
اب کے بہار کا یونہی گزرا برس تمام
(نسخۂ عرشی، ص ۵۵)

(یہ لفظ ''یوں'' اور ''ہی'' سے مرکب ہے؛ اِس بنا پر بھی اِس کا مرجّح املا ''یونہی'' یا ''یوں ہی'' ہوگا)۔

یہ ۔ یہ: مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں بیش تر ''یہ'' ملتا ہے اور کہیں کہیں ''یہہ''۔ مثلاً مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم میں پانچ بار ''یہ'' ہے اور ''یہہ'' موجود نہیں (مرقعِ غالب، ص ۲۱۳)۔ یا جیسے مکتوب بہ نامِ ناظم (مرقعِ غالب، ص ۱۹۸) میں ''یہ'' پانچ جگہ ہے اور ''یہہ'' ایک جگہ۔

یہ دو حرفی لفظ ہے (ی۔ ہ) اِس بنا پر اِس کو ''یہ'' لکھا جانا چاہیے۔ مرزا صاحب نے بھی بیش تر اِسی طرح لکھا ہے۔ ہاں ''یہہ'' میں مرزا صاحب نے ہ کا شوشہ (لٹکن) بھی لگایا ہے، مگر ''یہ'' کو اِس شوشے کے بغیر لکھا ہے۔ مرتّبینِ متن اگر چاہیں تو ''یہ'' لکھ سکتے ہیں۔ یعنی ''یہہ'' میں جو شوشہ لگایا گیا ہے، اُسے اِس شکل میں بھی لگایا جائے۔ مختصر یہ کہ ''یہ'' اور ''یہ'' دونوں املا بجائے خود صحیح ہیں اور منشاے مصنف کے خلاف نہیں۔ مرتّب جس املا کو چاہے، اختیار کر سکتا ہے۔

یہاں: دیکھیے ''وہاں''۔ اِس بات کو دُہرایا جاتا ہے کہ کلامِ غالب میں لازماً ''وہاں'' اور

''یہاں'' لکھے جائیں گے۔ انھیں اگر ''واں'' اور ''یاں'' لکھا جائے گا، تو یہ شکلیں منشائے مصنف کے خلاف ہوں گی۔ مرزا صاحب نے شروع سے آخر تک اپنے قلم سے ''یہاں'' اور ''وہاں'' لکھا ہے اور انھی کو 'افصح' بتایا ہے۔

دوسرا حصّہ

(اُصول۔ طریقِ کار)

(ا) الف اور ہائے مختفی:

عربی، فارسی کے ایسے لفظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہے، ایسے بیش تر لفظوں کو مرزا صاحب نے اصل کے مطابق، مع ہائے مختفی ہی لکھا ہے۔ بہ طورِ مثال ایسے کچھ لفظ: بہانہ، پایہ، تازہ، تعمیہ، چہرہ، حافظہ، دیباچہ، دیوانہ، رقعہ، رسالہ، روزینہ، رعشہ، رتبہ، زمانہ، زندہ، زوجہ، زیادہ، شیرازہ، شیوہ، عطیّہ، علاقہ، فاقہ، فائدہ، کرشمہ، کرایہ، گلہ، قرینہ، قطعہ، قلعہ، قصیدہ، لفافہ، معروضہ، مشاہدہ، مژدہ، مرثیہ، معاملہ، مقدّمہ، نامہ، وعدہ، ہرکارہ۔ (یہ سب لفظ مکاتیبِ غالب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم اور بہ نامِ نوّاب کلب علی خاں سے لیے گئے ہیں۔ اِن خطوں کے عکس مرقعِ غالب میں شامل ہیں۔ یہ التزام خاص کر یوں کیا گیا ہے کہ یہ خط مرزا صاحب کی عمر کے آخری دس گیارہ برسوں کی دستی تحریریں ہیں)۔

البتہ ''روانہ'' کو انھوں نے ''روانا'' بھی لکھا ہے؛ مگر ''روانہ'' زیادہ اور ''روانا'' اِس کے مقابلے میں کچھ کم۔ (اِس کی تفصیل پہلے حصے میں ''روانہ'' کے تحت آچکی ہے)۔ ایک اور لفظ ہے ''مزہ''، اِس کو مرزا صاحب نے ہر جگہ ''مزا'' لکھا ہے (اِس کی تفصیل پہلے حصے میں ''مزا'' کے تحت آچکی ہے)۔ اِس کا بہ خوبی امکان ہے کہ ایسے ایک دو لفظ اور بھی ہوں۔

چوں کہ مرزا صاحب نے ایسے لفظوں کو بہ طورِ عموم مع ہائے مختفی لکھا ہے اور ''روانہ'' کو بھی بیش تر اِسی طرح یعنی اصل کے مطابق لکھا ہے؛ اِس بنا پر قاعدہ یہ قرار پائے گا کہ ایسے سبھی لفظوں کو مرزا صاحب کی تحریروں میں مع ہائے مختفی ہی لکھا جائے۔ البتہ ایک لفظ ''مزا'' اِس قاعدے سے مستثنا رہے گا، کیوں کہ مرزا صاحب نے اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا ہے؛ اِسے اُردو تحریروں میں ''مزا'' لکھا جانا چاہیے (یہ ''مزہ'' کی مہنّد صورت ہوئی)۔ ہاں فارسی تحریروں میں اِسے اصل کے مطابق ''مزہ'' لکھنا چاہیے۔

(۲) عربی، فارسی، ترکی کے ایسے لفظ جن کے آخر میں اصلاً الف ہے؛ ایسے لفظوں کو بہ طورِ عموم مرزا صاحب نے اصل کے مطابق (یعنی صحیح طور پر) الف کے ساتھ لکھا ہے، جیسے: معمّا، تماشا، تقاضا، ناشتا، تمغا، حلوا، شوربا (وغیرہ)۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ کچھ لوگ لاعلمی کی وجہ سے یا کم توجہی کے سبب ایسے متعدّد لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی لکھ دیتے ہیں، مثلاً: معمّہ، تمغہ، حلوہ، ناشتہ (وغیرہ)۔ اُردو اور فارسی کی جملہ تحریروں میں ایسے سبھی لفظوں کے آخر میں الف لکھنا چاہیے؛ اِس بنا پر کہ اِن کا صحیح املا یہی ہے اور مرزا صاحب بھی اِسی طرح لکھتے تھے۔ ایسے غیر عربی، فارسی لفظ، اصلاً جن کے آخر میں الف ہے؛ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں اُن کے املا میں دورنگی پائی جاتی ہے۔ ایسے کچھ لفظوں کے آخر میں تو اُنھوں نے (اصل کے مطابق) الف ہی لکھا ہے، جیسے: پٹّھا، مہینا، گھنٹا، دھبّا، ٹھلیا، پتّا، گھونسلا، بھروسا، بھوکا۔ بعض لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی لکھی ہے، مثلاً: کیوڑہ[1]، پودینہ[2]، تھانہ[3]۔ دو لفظ اور ہیں جن کو مرزا صاحب نے ہر جگہ مع ہائے مختفی لکھا ہے، یہ ہیں: روپیہ اور راجہ۔ (اِن دونوں لفظوں سے متعلّق ضروری تفصیل پہلے حصّے میں لکھی جا چکی ہے)۔ فرق یہ ہے کہ ایسے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے آخر میں الف لکھا ہے اور اُن کے مقابلے میں ایسے لفظوں کی تعداد کم ہے (بل کہ بہت کم) جن کے آخر میں ہ لکھی ہے۔ ہاں دو لفظ راجہ اور روپیہ، ایسے ہیں جن کو مرزا صاحب نے مسلسل ہ کے ساتھ لکھا ہے۔

۱۔ مکتوب بہ نامِ نوّاب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۴۰)۔ ۲۔ ایضاً۔

۳۔ مکتوب بہ نامِ نوّاب یوسف علی خاں ناظم۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۰۲۔

چوں کہ ایسے زیادہ لفظوں کو مرزا صاحب نے اصل کے مطابق (اور صحیح طور پر) الف کے ساتھ لکھا ہے؛ اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ راجہ اور روپیہ؛ اِن دو لفظوں کو چھوڑ کر، باقی سب لفظوں کے آخر میں الف لکھا جائے[1]۔ روپیہ اور راجہ، اِن دونوں کو اِسی طرح (مع ہائے مختفی) برقرار رکھا جائے۔

اب رہے شہروں کے نام، جیسے شملہ، کلکتہ، مارہرہ، پٹیالہ: یہ اسماے خاص ہیں اور اِن کو عام طور اِسی طرح لکھا جاتا ہے اور مرزا صاحب نے بھی اِن کو اِسی طرح لکھا ہے؛ اِس لیے اِن کے اِسی املا کو برقرار رہنا چاہیے۔

(۴) ہائے مختفی اور ے: جن لفظوں کے آخر میں قائم صورت میں ہائے مختفی ہوتی ہے؛ محرّف صورت میں وہ ے سے بدل جاتی ہے، جیسے: مدرسہ، مدرسے میں۔ ایک مرثیہ، دو مرثیے۔ بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں تلفظ بدل جاتا ہے؛ اِس طور پر کہ ہائے مختفی سے پہلے جو حرف ہوتا ہے، اُس پر زبر ہوتا ہے؛ جب وہ جمع کی صورت میں آتا ہے، یا اُس کے آگے کوئی لاحقہ آتا ہے (مذکور ہو یا محذوف) تو وہ زبر، زیر سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے درجہ، اِس میں ج پر زبر ہے۔ یہ قائم صورت ہے۔ چار درجے، درجے میں (وغیرہ) جب کہا جائے گا، تو جیم کے نیچے زیر آجائے گا۔ اِسی لیے محرّف صورت میں، تلفظ کی مناسبت سے ہائے مختفی کی جگہ ے آجاتی ہے (یہی احوال ہوتا ہے اُن لفظوں کا جن کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ جیسے: لڑکا، لڑکے، لڑکے نے)۔ جن لفظوں میں تلفظ کی سطح پر ایسی تبدیلی نہیں ہوتی، اُن میں یہ املائی تبدیلی بھی نہیں ہوتی، جیسے: ایشیا میں، دُعا سے، افریقہ میں (وغیرہ)۔

۱۔ مرزا صاحب کے لکھے ہوئے نصاب نامے قادر نامہ میں ایسے معتدٌبہ لفظ آئے ہیں اور سب کے آخر میں الف ملتا ہے۔ قادر نامہ پہلی بار مرزا صاحب کی زندگی میں مطبع محبس پریس دہلی میں چھپا تھا۔ سالِ طبع ۱۲۸۰ھ (دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، حاشیہ ص ۲۷۵)۔ نسخۂ عرشی سے ایسے قابلِ ذکر الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں: نیولا، مٹکا، مُچھلیا، پتا، کینکوا، کچھوا، کندھا، نخنا، مسا، چھالا، گلا، گوزا، چوہا، تاگا، چولھا، گھونسلا، دھبا، تانبا، کیلا، نالا، آٹا، پچھواڑا، پُڑیا، جھنجھنا، بھولا، تانا، بانا، دہینا، باجا، بسترا، چھالیا۔ اِن لفظوں کے قیاس پر ایسے باقی لفظوں کو بھی اِسی طرح لکھا جانا چاہیے، جیسے: پسینا (رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا) سہرا، جھنڈا، جوتا (وغیرہ)۔

مرزا صاحب کی تحریروں میں اِس سلسلے میں دورنگی پائی جاتی ہے۔ کہیں تو اُنھوں نے محرّف صورت میں قاعدے کے مطابق ے لکھی ہے اور کہیں بے احتیاطی اور کم توجّہی کی پیدا کی ہوئی عام روش کے مطابق ہائے مختفی کو برقرار رکھا ہے۔ مثلاً تفتہ کے نام ایک خط کا عکس خطوطِ غالب، میں شامل ہے (ص ٦ کے مقابل) اُس میں ''محلّے میں'' اور ''نشے میں'' لکھا ہے اور ''کرایہ کو لے کر'' لکھا ہے۔ یعنی دو جگہ قاعدے کے مطابق اور ایک جگہ بے قاعدگی کے ساتھ (مگر عوامی روش کے مطابق)۔ یا جیسے مولوی ضیاء الدّین خاں دہلوی کے نام اُن کے طویل خط کا عکس (علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء میں شامل ہے) اُس میں: منطق و فلسفہ میں، کتاب خانے سے، کتاب خانے پارس کے، اِسی واقعہ کو، حصّے میں آئی ہے، رسالے مرتّب ہوگئے، تسمیہ میں ملتے ہیں۔ پہلے ٹکڑے کے متعلّق تو ایک جواز یہ ہوسکتا ہے کہ وہ فارسی ترکیب ہے، اِس لیے اِسے اُردوایا نہیں گیا (اگر چہ یہ محض برائے بحث والی تاویل ہوگی) خیر، فی الحال اِسے الگ کرلیجیے؛ تو پھر چھے ٹکڑے بچے، جن میں سے چار ٹکڑوں میں ے آئی ہے اور دو ٹکڑوں میں ہ برقرار رہی ہے۔

مرقّعِ غالب میں مرزا صاحب کے ایسے بیاسی خطوں کے عکس شامل ہیں جو نوّاب یوسف علی خاں ناظمؔ اور نوّاب کلبِ علی خاں کے نام ہیں اور بہ خطِ غالب ہیں۔ میں نے جائزہ لیا اور شمار کیا تو اِن خطوں میں (جو مرزا صاحب کی زندگی کے آخری دس گیارہ برسوں کی تحریریں ہیں) اڑتیس مقامات پر محرّف صورت میں لفظ کے آخر میں ے لکھی گئی ہے اور اڑتالیس جگہوں پر ہائے مختفی ملتی ہے۔

اِس سلسلے میں ایک اور پہلو بھی نظر میں رکھنے کا ہے۔ عرشی صاحب نے اِسی سلسلے میں دیباچہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے کہ مرزا صاحب نے:

> ''انتخابِ اُردو میں تین چار جگہ اور ناظمؔ و بیتابؔ کے مسوّدوں میں ایسے تمام الفاظ کی ہ قلم زد کرکے، اُس کی جگہ ے بنادی ہے؛ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر تلفّظ کے

مطابق املا کو پسند کرتے تھے۔

ہاں ایک لفظ ''ریختہ'' ایسا ہے جسے انھوں نے تلفظ کے خلاف لکھا بھی ہے اور لکھوایا بھی ہے۔ نواب ناظم کے اس شعر میں:

یہ طرز کسی اور کو کب یاد ہے ناظمؔ

ہیں ریختے میں پیروِ اندازِ حزیںؔ ہم

میرزا صاحب نے ''ریختے'' کو اپنے قلم سے ''ریختہ'' بنادیا ہے۔

میری رائے میں ''ریختہ'' کی یہ اصرار ''ریختی'' سے التباس دور کرنے کے خیال سے ہوگا، جو اُس زمانے میں یائے معروف و مجہول کی کتابت میں فرق نہ ہونے کے سبب بہ سہولت پیدا ہوسکتا تھا'' (ص ۲۲۷)۔

عرشی صاحب نے بیتابؔ کے ایسے دو شعر بھی درج کیے ہیں جن میں مرزا صاحب نے یہ اصلاح کی ہے۔ بیتابؔ کا شعر تھا:

نکلی دل و جگر کو مگر آہ توڑ کے
سینہ سے شب جدا جو ہوا خوں میں بھر کے ہاتھ

مرزا صاحب نے ''سینہ'' کو قلم زد کر کے ''سینے'' بنادیا۔ دوسرا شعر تھا:

نہیں تلوار کے آنے کی بھی اب کچھ حاجت
تیرے ابرو کے اشارہ نے مارا قاتل

مرزا صاحب نے اِس طرح اصلاح کی کہ املا کا عیب دور ہوگیا اور مصرعے کا وزن بھی درست ہوگیا۔ ''اشارہ'' کو قلم زد کر کے، اُس کی جگہ ''اشارے ہی'' لکھ دیا (ایضاً، ص ۱۰۸)۔ اِن دو اصلاحوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اِس سلسلے میں اصولاً تلفظ کے مطابق املا کو ضروری سمجھتے تھے؛ یہ الگ بات ہے کہ عام بے توجہی کی پھیلائی ہوئی بے امتیازیِ املا میں بھی مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔

چوں کہ اصلاحوں میں مرزا صاحب نے محرَّف صورت میں ہائے مختفی کو ے سے بدل دیا ہے (اور اِس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ اِس قاعدے کو مانتے تھے کہ ایسی

صورتوں میں املا، تلفّظ کے مطابق ہونا چاہیے) اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ خود انھوں نے بہت سے مقامات پر اِس طریقِ کتابت کی پیروی کی ہے؛ اِس بنا پر قاعدہ یہ ہوگا کہ کلامِ غالب میں محرّف صورت میں ہر جگہ لفظوں کے آخر میں ہ کی جگہ ے لکھی جائے (جیسے: اشارے سے، مرتبے میں، کعبے کو)۔ چوں کہ اب معروف اور مجہول آواز کی مناسبت سے ی اور ے کی کتابت میں امتیاز کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لیے ''ریختہ'' کو بھی محرّف صورت میں ''ریختے'' لکھا جائے گا۔[1]

(۵) اعراب بِالحروف:

اعراب بِالحرف کے طور پر مرزا صاحب نے کچھ لفظوں میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو لکھا ہے۔ یہ اُس زمانے کی روش تھی (جس کے بچے کھچے نشان ''دوکان، پہونچنا، لوہار'' جیسے کچھ لفظوں میں آج بھی نظر آجاتے ہیں)۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے:

> ''میرزا صاحب لفظ کے شروع میں واقع ہونے والے الفِ مضموم کے علاوہ، ہر جگہ اعراب بِالحروف کو ناپسند کرتے تھے...
>
> ناظم کا ایک شعر ہے: 'واں کے جانے سے رکے اور آ گئی فصلِ بہار...' کاتب نے اِس میں ''روکے'' لکھا تھا، میرزا صاحب نے واو قلم زد کر دیا ہے۔ ایک شعر میں ''دوکان'' تحریر ہو گیا تھا، اُس کا بھی واو کاٹ دیا ہے... خود مرزا صاحب کے انتخابِ دیوانِ اُردو میں کاتب نے لکھا تھا: ''کھولتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ''؛ اِسے میرزا صاحب نے ''کھلتا'' بنا دیا ہے'' (دیباچہ مکاتیبِ غالب، ص۲۲۲)۔

مرزا صاحب کی جو دستی تحریریں پیشِ نظر ہیں، اُن میں الف کے پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو ملتا

---

[1] نسخہ عرشی میں اس کی پابندی کی گئی ہے:

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں، اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا (ص ۱۵۹)

ہے۔ اُس اور اُن کو ہر جگہ ''اوس'' اور ''اون'' لکھا ہے (جہاں اِن لفظوں میں واو نہیں، وہاں انھیں ''اِس اور ''اِن'' پڑھا جانا چاہیے)۔ ایسی چند مثالیں: اوٹھا، اوٹھا کر (اُٹھا، اُٹھا کر)، بعد پالکی کے اوتر آنے کے (عکس: مرقعِ غالب، ص ۱۰۰) اون پر، اوسی (ایضاً)۔ اوٹھ آیا ہوں (عکس: خطوطِ غالب، ص ۷ کے مقابل) اوتر نہیں سکتا (عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۲۹۹) اولٹا (۱۴۵۷)، اوڑا دی (۱۴۵۷)، پکار اوٹھی (۱۴۷)، اوڑ گئے (۶۷۳)، اوترا ہوا ہے (۶۷۶)، اولجھے ہوئے ہیں (۶۷۶)، اودھار (۱۳۰۱)۔ ایک خط میں ''مُنہ'' کو ''مونہہ'' لکھا ہے اس شعر میں:

''کعبہ کس مونہہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو مگر نہیں آتی''

(مکتوب بہ نامِ علائی، عکس: غالب کے خطوط، ص ۳۸۹)

اب یہ روش گویا ختم ہو چکی ہے، اِس لیے اب کسی بھی لفظ میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو نہیں لکھا جائے گا۔ ''اوس'' اور ''اون'' کی جگہ اُس اور اُن لکھنا چاہیے (اِن کے مقابل: اِس اور اِن)۔ اِسی طرح اُٹھنا، اُترنا، اُلٹا، اُدھار، اُلجھے ہوئے (وغیرہ)۔ الفِ مضموم پر پیش لگانا ضروری بھی ہے (خاص کر اُس اور اُن میں) اور مناسب بھی۔

(۶) لائے، لاے، لایئے:

آئے، جائے، لائے جیسے فعل، اور اِن کی تعظیمی صورتیں، جیسے: آیئے، جایئے، لایئے: اِن کے املا میں مرزا صاحب کی تحریروں میں یک رنگی نہیں ملتی۔ بہت سے لوگوں کے یہاں املا کے سلسلے میں جو نہجار ہوا کرتا تھا (اور جواب بھی دیکھنے میں آتا رہتا ہے) کہ اِن پر ہمزہ لکھنے یا نہ لکھنے کے سلسلے میں کسی طرح کا تعیّن نہیں، یہی عام املائی عدمِ اہتمام اِس سلسلے میں مرزا صاحب کی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے کہیں ''آئے، جائے'' لکھا ہے اور کہیں ''آے''، ''جاے'' (بغیر ہمزہ)۔ مختلف افعال کی یہ صورتیں اُن کی تحریر میں بہ طورِ عموم سامنے آتی ہیں۔ کہیں کسی طرح کا اہتمام یا امتیاز نہیں کہ اُس فعل کی اِس صورت میں ہمزہ لکھا جائے گا یا نہیں لکھا جائے گا۔ ایک ہی سطر میں اور ایک ہی مصرعے میں دونوں صورتیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً، ع: ''اُس پہ

بن جاے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے''۔ ''تمھارا خط آے اور میں جواب نہ لکھوں'' (عکس: غالب کے خطوط، ص ۵۳۷)۔ ''میرے اِس خط کا جواب جلد آے (ایضاً، ص ۶۱۷) ''اگر یچ ہو جاے'' (ایضاً، ص ۵۳۸)۔ ''مرزا آغا جانی صاحب آے تھے'' (ایضاً، ص ۶۷۲) ''دونوں آئے ہوئے ہیں'' (ایضاً) ''میرے پاس آئے تھے'' (ایضاً)۔ ''میرے پاس آئے، خط کھلا ہوا لائے'' (ایضاً، ص ۶۷۶) آیگا (ایضاً)، ''عرض کیا جایگا'' (ایضاً، ص ۱۲۷۰) ''یہاں آیگا'' (ایضاً، ۱۲۷۰)۔ ''جواب آیگا'' (ایضاً، ص ۱۲۸۳)۔ ''تقسیم کردیئی ہیں'' (ایضاً، ص ۱۲۱۹)۔ ''صاد کردیٔ ہیں'' (ایضاً)۔ ''بھیجی جائیگی'' (ایضاً، ص ۱۲۸۸)، ''پہنچ جائیگی'' (ایضاً)۔ ''درج کیا جائے'' (ایضاً، ص ۱۲۸۰) ''لکھ دیا جائے'' (ایضاً)، ''بھیجنے پائے''، شامل ہو جائے'' (مرقعِ غالب، ص ۲۳۵)۔ نہیں پای (غالب کے خطوط، ص ۱۲۶۳) ''نہ پائی'' (ایضاً)۔ ''اطلاع پائی'' (۱۲۶۴)۔ '' آپ کلکتے تشریف لیجائیگا یا نہیں (ایضاً، ص ۱۲۹۸)۔ جاری ہو جایگا (ایضاً ص ۱۲۹۶) نہ فرمائیں گے (ایضاً، ص ۱۲۹۶)، پاے (ایضاً ۱۲۶۵) پسند آے (۱۲۶۲)۔ ''آونگا'' ہمزہ کے بغیر، اُسی جملے میں ''جاؤنگا'' مع ہمزہ: حضرت کی خدمت میں نہ آونگا تو اور کہاں جاؤنگا'' (ایضاً، ص ۱۲۸۰) ایک جگہ تشریف لایئے (ایضاً، ۳۷۷) اعتنا نہ فرمایئے (مرقعِ غالب، ص ۲۴۲) چاہیئے (ایضاً) چاہیئے (غالب کے خطوط، ص ۷۲۵)۔ اِن مثالوں میں ''لایئے'' اور ''فرمایئے'' کے آخری ''یئے'' میں تین حرف ہیں: ءِ یِ ے۔ اور ''چاہیئے'' کے آخری جُز ''ہیئے'' میں چار حرف ہیں: ہِ ءِ ی ے۔ (ایسی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں)۔

آئے، جائے وغیرہ کی ایک شکل (یا یوں کہیے کہ پرانی شکل) آوے[۱]، جاوے (وغیرہ) ہے۔ واو کی جگہ ہمزہ نے لے لی۔ اِس طرح لاوے، لائے بن گیا۔ اِس لحاظ سے ہمزہ تو ایسے افعال میں جزوِ لفظ ہے، اُس کو تو لازماً لکھا جانا چاہیے۔

۱۔ منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب = کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے (نسخۂ عرشی، ص ۲۳۵) اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے = کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو (ایضاً، ص ۱۹۴) آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے، کہ تا = تجھ پہ کھل جاوے کہ اِس کو حسرتِ دیدار ہے (ایضاً، ص ۲۱۲)۔ کئی غزلوں کی ردیف میں اور ایک غزل کے قوافی میں افعال کی یہ صورت ملتی ہے۔ ایسی غزلوں کے مطلع یہ ہیں:

چوں کہ مرزا صاحب نے آئے، جائے جیسے افعال کو مع ہمزہ بھی لکھا ہے اور اصولاً بھی اِن میں ہمزہ لکھا جانا چاہیے، یوں کہ وہ جزوِ لفظ ہے؛ اِس بنا پر مرزا صاحب کے کلامِ نظم ونثر میں ایسے سب افعال کو لازماً مع ہمزہ لکھا جانا چاہیے، مثلاً: جائے، لائے، پائے، آئے۔ آئی، پائی، لائی، کھائی۔ آئی۔ آؤ، لاؤ، پاؤ، کھاؤ۔ ہوئے، ہوئی۔

تعظیمی افعال کی صورتوں میں آخری جز میں دو ی ہوتی ہیں اور مرزا صاحب نے اِس طرح لکھا بھی ہے، جیسے: فرمائیے (ءِ۔یِ۔ے)، لائیے (ءِ۔یِ۔ے) اِس بنا پر ایسے جملہ افعال میں آخری جز ''یے'' (ی ے) ہوگا، مثلاً: چاہیے، پائیے، لکھیے، پڑھیے، دیکھیے، بُنیے۔

اِس سلسلے میں عرشی صاحب کا یہ اقتباس بھی توجہ طلب ہے:

''اُردو کے جن الفاظ میں الف یا واوِ مدّہ کے بعد ی واقع ہوتی ہے، جیسے: جاے، یا ہوے؛ میرزا صاحب کی تحریروں میں ان کی کتابت بھی یکساں نہیں ہے۔ وہ کبھی اِنھیں بے ہمزہ کے، اور کبھی ہمزہ کے ساتھ ''جائے''، ''ہوئے'' لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح یاے مدّہ کے بعد ی ہو، جیسے: کیے؛ تو یاے اوّل کو کبھی

....دوست غم خواری میں میری، سعی فرماویں گے کیا= زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا (ایضاً ص ۱۵۵) قتلِ عشاق نہ غفلت کشِ تدبیر آوے = یارب، آئینہ بہ طاقِ خمِ شمشیر آوے (ص ۱۱۳) تا چند نفس غفلتِ ہستی سے برآوے = قاصد تپشِ نالہ ہے، یارب خبر آوے (ص ۱۱۳۔ ۲۲۹) جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے = جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے (۲۳۳) نواے خفتۂ الفت اگر بے تاب ہوجاوے = پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہوجاوے (۱۰۵) خطر ہے، رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہوجاوے = غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہوجاوے (ص ۲۱۳۔ ۸۰) ''لیوے''، ''کھوے'' اور ''دھوویں'' جیسی صورتیں بھی ملتی ہیں: یہ کون کھوے ہے آباد کر ہمیں لیکن = کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے (ص ۳۲۰)۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر، طراوت سبزۂ خط سے = لگاوے خانۂ آئینہ میں روے نگار، آتش (ص ۱۷۳)۔ عشاقِ اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ = دیتا ہے اور، جوں گل وشبنم، بہار داغ (ص ۴۸)۔ خطوں میں بھی افعال کی یہ صورت ملتی ہے،: ''جو حضرت کے مزاج میں آوے'' (مکتوب بہ نامِ نواب کلب علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۷۹۔ مرقومہ ۷/ ستمبر ۱۸۶۸ء)۔ ''ہماری محنت تو ضائع نجاوے'' (مکتوب بہ نامِ تفتہ۔ عکس: خطوطِ غالب، ص ۶ کے مقابل۔ مرقومہ ۲۲/ مارچ ۱۸۵۲ء)۔

بہ صورتِ ہمزہ، اور کبھی بہ صورتِ یا، اور کبھی ی اور ہمزہ دونوں کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن نواب ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں کیجئے، چاہیئے، دیکھیئے، پوچھئے، ہمسائے، آجائے، لائے، لگ جائیگی، آئے ہو، ہوئے، پھیلا دیئے وغیرہ میں سے ہمزہ کو قلم زد کر دیا ہے۔ یہ اِس پر دال ہے کہ میرزا صاحب اِن لفظوں کو بے ہمزہ کے انسب جانتے تھے۔" (دیباچہ مکاتیبِ غالب، ص ۲۲۸)۔

اِس اقتباس میں کئی طرح کے الفاظ گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ "ہمسائے" جمع ہے "ہمسایہ" کی اور اِس کی وہ صورت نہیں جو مثلاً جائے اور آئے کی ہے۔ اِسی طرح دیکھیے اور لائے بھی الگ الگ صورتیں ہیں۔ اِن سب کو ایک خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔

مرجّح (یا صحیح) صورت وہی ہے جس کا حوالہ اوپر آیا ہے؛ یعنی آئے، جائے، لائے، پائے۔ آؤ، لاؤ، جاؤ، پاؤ۔ آئی، لائی، پائی، کھائی۔ آئے گا، جائے گا۔ آؤ گے، جاؤ گے۔ آئیں گے، جائیں گے۔ "ہمسایہ" محرف صورت میں "ہمسایے" لکھا جائے گا اور مثلاً "کرایہ" محرف صورت میں "کرایے" (کرایے پر لیا ہے)۔

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں عرشی صاحب نے آئے، جائے جیسے افعال کو کہیں تو اِسی طرح لکھا ہے اور کہیں آے، جاے (بغیر ہمزہ)۔ یہ دو رنگی ٹھیک نہیں۔ اِنھیں ایک ہی طرح لکھا جانا چاہیے؛ یعنی: آئے، جائے، لائے (وغیرہ)۔ اِسی طرح آئے گا، جائے گا (وغیرہ)۔

(۷) قائل، قایل:

عربی کے ایسے الفاظ (بیش تر اسمِ فاعل اور اسمِ جمع) کو بھی مرزا صاحب نے کئی طرح لکھا ہے، بعض مثالوں سے اِس کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ ایک خط میں "قایل، لطایف، مائل، سائل، نظائر" مرقوم ہیں (مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدین خاں۔ عکس: علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹۔ ۱۹۴۸ء)۔ قایل اور لطایف میں صرف ی ہے اور باقی تین لفظوں میں ی پر ہمزہ

ہے۔اِس خط میں ''نظائیر'' لکھا ہے، مگر مکتوب بہ نامِ فرقانی میرٹھی میں ''نظایر'' صرف ی کے ساتھ لکھا ہے (غالب کے خطوط، ص۷۲۹)۔ پہلے خط میں ''مائل'' لکھا ہے اور مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں میں ''مایل'' ہے، ع: ''ہم نہ تبلیغ کے قایل، نہ غلو کے مایل'' (مرقعِ غالب، ص۲۱۱)۔مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدّین خاں میں ''سائل'' لکھا ہے اور مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں میں ''سایل'' لکھا ہے (مرقعِ غالب، ص۲۷۲)۔ حقایق و دقایق (خطوطِ غالب، ۱۲۹۲)، فائدہ (۱۲۹۳)، طبایع (ایضاً، ۱۲۸۸)، طایر (ایضاً، ۱۲۹۹)، نفسِ مطمیئنہ (ایضاً ۷۳۲) نفسِ مطمئنہ (ایضاً ۱۲۹۲)، عزایم، لایق (ایضاً، ۷۳۹)، نظایر (ایضاً، ۷۲۹)، جائیز، ضَایع، صایٔب (خطوطِ غالب، ص۶) (''صنایع'' میں صرف ی، باقی دونوں لفظوں میں ی اور ہمزہ دونوں)۔ایسی مثالیں بڑی تعداد میں پیش کی جاسکتی ہیں۔عرشی صاحب نے دیباچہ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے:

> ''جن عربی اسمِ فاعل کے صیغوں میں الف کے بعد ی آتی ہے، جیسے: دائم، قائم وغیرہ؛ اُن کا املا ہمزہ کے ساتھ ہے: مگر میرزا صاحب نے بیش تر ی کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اگر ہمزہ ہے، تو ی کے اوپر...لفظِ قائل اور مائل کو پہلے قائل اور مائل لکھا تھا؛ اُس کے تیرہ دن بعد قایل اور مایل لکھا۔
>
> یہی حال عربی کی اُن جمعوں کا ہے، جو فواعل کے وزن پر آتی ہیں، مثلاً: حقائق، دقائق۔ میرزا صاحب نے اِنھیں بھی حقایق، دقایق، طبایع وغیرہ لکھا ہے، جو عجمیوں کی پیروی ہے۔
>
> ''مولانا'' اور ''اولانا'' کی کتابت میں میرزا صاحب کے یہاں دورنگی پائی جاتی ہے۔ایک مکتوب میں اُنھوں نے ''مولانا'' لکھا ہے؛ مگر اُس کے سولہ دن بعد ''مولنا'' اور ''اولنا'' لکھا ہے'' (ص۲۳۲)۔

جیسا کہ عرشی صاحب نے لکھا ہے، ایسے الفاظ کا ''املا ہمزہ کے ساتھ ہے''؛ اِس بنا پر ایسے جملہ الفاظ میں صرف ہمزہ لکھنا چاہیے[1]، مثلاً: قائل، مائل، سائل، جائز، صنائع، غائب، صائب، حائل، مسائل، طبائع، حقائق، دقائق، عجائب وغرائب، کوائف، فائدہ، جائزہ، شائبہ (وغیرہ)۔

(۸) کچھ لفظ ایسے ہیں جن میں عربی کے طریقِ کتابت کے مطابق الف یا واو پر ہمزہ بھی لکھنا چاہیے؛ مگر اُردو میں بہ طورِ عموم اُن کو ہمزہ کے بغیر لکھا جاتا ہے۔ بس ایک لفظ ''جرات'' ایسا ہے جسے کچھ لوگ ''جرأت'' لکھتے ہیں؛ لیکن مرزا صاحب نے اِسے بھی ہمزہ کے بغیر لکھا ہے۔ چوں کہ مرزا صاحب نے ایسے لفظوں کو ہمزہ کے بغیر لکھا ہے؛ اِس بنا پر اصول یہ قرار پائے گا کہ ایسے سبھی لفظوں کو ہمزہ کے بغیر لکھا جائے۔ اِس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عرشی صاحب نے ایسے سبھی لفظوں کو دیوانِ اُردو نسخہ عرشی اور مکاتیبِ غالب میں (مرزا صاحب کے طریقِ نگارش کی مطابقت میں) ہمزہ کے بغیر ہی لکھا ہے۔ ایسے زیادہ مستعمل لفظ یہ ہیں: تاسّف، تامّل، توام، جرات، متاثر، متاخر، متاخرین، تاثُر، مونث، موثر (حصّہ اول میں ''تامّل'' اور ''جرات'' کے تحت اِس کی تفصیل لکھی جا چکی ہے)۔

(۹) مرزا صاحب نے انگریزی کے لفظوں کو جس طرح لکھا ہے، اُن کے اُسی املا کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اصل زبان کی رعایت یا اُردو میں اب استعمالِ عام کی مطابقت کی خاطر اُن کے املا میں تبدیلی نہیں کی جانا چاہیے۔ مثلاً مرزا صاحب نے سارتی فکٹ، جرنیل، رزیڈنٹ، کپتنی، کنپ، اسٹیسن، پنسن، لاڑد، دلھوسی، ہاردنگ لکھا ہے (وغیرہ)؛ اِن لفظوں کے اور ایسے دوسرے لفظوں کے املا کو اُسی طرح برقرار رکھنا چاہیے جس طرح مرزا صاحب نے اُن کو اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اگر تبدیلی کی جائے گی، تو اُسے تحریف کہا جائے گا۔

۱۔ دیوانِ غالب نسخہ عرشی میں ایسے بھی لفظوں کو اِسی طرح لکھا گیا ہے؛ مثلاً: عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا (ص ۱۴۵)، غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا (۱۵۵)، تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا (۳۱۱)، نہ حشر ونشر کا قائل، نہ کیش وملت کا (۳۱۲)، فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسد (۱۵۱)، اُسے فضائلِ علم وہنر کی افزائش (۲۶۳) پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے (۲۶۱)۔

(۱۰) دعویٰ، دعوی:

دعوی، عیسی، لیلی، تقوی، فتوی جیسے لفظوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اِن کے آخر میں ی لکھی جاتی ہے، لیکن تلفظ میں وہ ی، الف کی آواز دیتی ہے۔ ایسے سبھی لفظ عربی سے آئے ہیں اور اِس خصوصیت کو وہیں سے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ اِن لفظوں کی ایک یہ صورت بھی نمایاں ہوئی کہ کتابت کے لحاظ سے اِن کو ایسے لفظوں کا ہم قافیہ کیا گیا جن کے آخر میں یاے معروف ہوتی ہے، اور تلفظ کی رعایت سے یہ ایسے الفاظ کے ہم قافیہ بھی ہوئے جن کے آخر میں الف لکھا جاتا ہے۔ کلامِ غالب میں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ اوّل الذکر صورت میں تو کسی طرح کی املائی تبدیلی نہیں ہوئی، بس تلفظ بدل گیا؛ کہ ایسے قوافی میں اِن لفظوں کو بہ یاے معروف پڑھا گیا۔ (یہ تبدیلی فارسی[۱] میں ہو چکی تھی) مثلاً مرزا صاحب کی وہ غزل جس کا مطلع ہے:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اِس میں یہ مصرعے بھی ہیں: گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا۔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا (نسخۂ عرشی، ص ۱۱۴)۔ یا جیسے یہ مطلع:

بیتابیِ یادِ دوست، ہم رنگِ تسلّی ہے موجِ تپشِ مجنوں، محمل کشِ لیلی ہے

اِس غزل میں دوسرے قوافی زنگی، ساقی، خالی وغیرہ ہیں (ایضاً، ص ۱۱۴)۔ جب یہ لفظ ایسے لفظوں کے قوافی میں آئے، جن کے آخر میں الف لکھا جاتا ہے؛ اُس صورت میں یہ املائی تبدیلی نظر آتی ہے کہ اِن کے آخر میں ی کی جگہ الف لکھا گیا، مثلاً یہ مصرع: گردشِ مجنوں بہ چشمک ہاے لیلا آشنا۔ اِس غزل کے دوسرے قوافی ہیں: پیدا، تیرا، وغیرہ اور "آشنا" ردیف ہے (ایضاً، ص ۱۴۹)۔ یا جیسے: کیوں اِسے نقشِ پےِ ناقۂ سلما کہیے۔ قوافی: شیدا، اچھا (وغیرہ) یہ تبدیلی اُسی انداز کی ہے جیسی اُن لفظوں میں ہوتی ہے جن کے آخر میں ہاے مختفی ہو (جیسے: گلہ، اشارہ) اور

۱۔ صرف ایک مثال۔ ابوطالب کلیم ہمدانی کے دیوان کی پہلی غزل کے یہ اشعار:

بدل کر دم بمستی عاقبت زہد ریائی را رسانیدم بآب از یمنِ مے بنیادِ تقوی را
گذشتن از جہاں نابد زپاے ہمتِ ہر کس نباشد ہیچ معجز بہتر از تجریدِ عیسی را
بود آرایشِ معشوق حالِ درہمِ عاشق سیہ روزیِ مجنوں، سرمہ باشد چشمِ لیلی را
پس از دردِ جدائی محبت لیام نہ نماید ز آتش ہیچ پروانیست دور از آب ماہی را
دو مصرع در سبکروحی کلیم آں طور میباید کہ در پروازِ شہرت بال باشد مرغِ معنی را

(دیوانِ کلیم ہمدانی، مرتبہ ڈاکٹر شریف النسا بیگم انصاری، جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد، ص ۲۶۱)

وہ اُن لفظوں کے ہم قافیہ ہوں جن کے آخر میں الف ہوتا ہے، جیسے:

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے   یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے تو گِلا ہوتا ہے

(نسخۂ عرشی، ص ۲۴۰)

اِس اعتبار سے قافیوں کی رعایت سے یہ دونوں تبدیلیاں درست ہیں اور اِن سے کسی طرح کے املائی مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ ایسے لفظوں میں املائی اُلجھن پیدا ہوتی ہے دو صورتوں میں۔ ایک تو یہ کہ کہیں اِن کے آخر میں ی لکھی جائے اور کہیں الف لکھا جائے، مثلاً کہیں "دعوی" لکھا جائے اور کہی "دعوا"۔ نسخۂ عرشی سے ایسی بس چند مثالیں: عالمِ تسلیم میں یہ دعوی آرائی عبث (ص ۳۴)، خانماں نہا پائمالِ شوخیِ دعوا اسد (ص ۸۳)۔ جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا (ص ۱۴۸)، جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا (ص ۱۶)۔ خرمن بباد دادۂ دعوی ہیں، ہوسو ہو (ص ۴۹)، مجھ میں اور مجنوں میں، وحشت سازِ دعوا ہے اسد (ص ۶۳)۔

یہاں اُلجھن کی بات یہ ہے کہ "دعوا" کیوں لکھا گیا (قافیے میں تو آیا نہیں)۔ بہ ظاہر ایسی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی جس سے اِس کا جواز نکل سکے۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں کہیں "دعوا" نہیں ملتا۔ اِس قبیل کے جتنے لفظ ہیں، اُن کے آخر میں (قافیے کے علاوہ) اگر کہیں الف لکھا جائے، تو اُس کی وضاحت لازماً کرنا ہوگی اور ایسی کوئی وضاحت موجود نہیں۔ اصولاً یہ اختلافِ املا (دعویٰ۔ دعوا) کسی بھی طور پر قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا۔

توجہ طلب اختلافِ املا کی دوسری صورت اضافی اور توصیفی ترکیبوں میں سامنے آتی ہے، اِس طور پر کہ (الف) کہیں تو ی کو مکسور مان لیا گیا ہے، جیسے: دستِ موسی بسرِ دعویِ باطل باندھا (ص ۱۴)، لیلیِ معنی اسد محمل نشینِ راز ہے (ص ۸۲) اور یہ بہ جائے خود درست ہے اور قاعدے کے مطابق۔ مرزا صاحب نے بھی اِس طرح لکھا ہے: "اب مجھے اِس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے، مگر دعویِ[1] اجتہاد نہیں" (مکتوب بہ نامِ نواب کلبِ علی خاں۔ عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۵۱)۔

۱۔ اصلاً آخری ی کا حرفِ ماقبل مفتوح ہوتا ہے، مگر دو صورتوں میں وہ زبر، زیر سے بدل جاتا ہے۔ ایک صورت تو وہ ہے جب یہ لفظ ترقّی، کبھی جیسے لفظوں کے ہم قافیہ ہوں، اور دوسری صورت وہ ہے جب یہ موصوف یا مضاف ہوں، جیسے: دعویِ وفا، لیلیِ معنی (وغیرہ)۔ ایسے لفظوں سے متعلق میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب اردو املا میں بحث کی ہے ص ۴۵۔ ص ۵۶۔

''کاغذے کہ مناط دعوی فدوی برآنست'' (عرضیِ غالبؔ، بہ خطِ غالبؔ، عکس مشمولہ نامہ ہای فارسیِ غالب، ص ۱۱۶ کے مقابل)۔

(ب) وزنِ شعر کی ضرورت سے اِس یؔ کو مشدّد مان لیا گیا۔ اصولاً یہ درست ہے، یوں کہ وزنِ شعر کی رعایت سے اِس یؔ کو مشدّد نظم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً: عیسیِ مہرباں ہے شفاریز یک طرف (ایضاً، ص ۴۹)۔

(ج) اُلجھن پیدا ہوتی ہے ایسی اضافی اور توصیفی ترکیبوں میں جہاں ایسے لفظوں کے آخر میں (وزنِ شعر کی رعایت سے) الفؔ لکھا گیا ہے، جیسے: بلبلِ تصویر و دعوائے پر افشانی عبث (نسخۂ عرشی، ص ۳۴) رنگ ہے سنگِ محک، دعوائے بینائی عبث (ایضاً) تا آبلہ دعوائے تنک پیرہنی ہے (ص ۱۱۱)، یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے (ص ۲۱۰)، دعوائے جنوں باطل، تسلیم عبث حاصل (ص ۱۰۹) وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد (ص ۲۱۴)، وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں (ص ۱۳۴)۔

اُلجھن کی بات یہ ہے کہ الفؔ کیوں لکھا گیا، ''عیسیِ مہرباں'' کی طرح ''دعویِ عشق'' اور ''دعویِ جنوں'' کیوں نہیں لکھا گیا۔ بہ ظاہر ایسا کوئی قاعدہ نہیں جس کی بنیاد پر الفؔ لکھا جائے اور نہ مرزا صاحب نے کہیں اِس طرح لکھا ہے: ایسی صورت میں ایسے لفظوں کا یہ املا کس طرح قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔

مرتّبِ کلامِ غالبؔ (یا مجلسِ مرتّبین) کے لیے یہ مسئلہ (ایسے بعض دوسرے مسائل کی طرح) خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ سارے متعلّقات پر غور کرنے کے بعد، یکساں طریقِ املا کو اختیار کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی لفظ ایک جگہ ایک طرح لکھا ہوا ہو اور دوسری جگہ دوسری طرح۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کچھ طے کیا جائے، اصولوں اور قواعد کی روشنی میں اور مرزا صاحب کی دستی تحریروں کی روشنی میں طے کیا جائے اور حواشی میں اُس کی وضاحت بھی کی جائے۔

میں ذاتی طور پر ایسے جملہ مقامات پر مرزا صاحب کے طریقِ کتابت کو اور فارسی اُردو میں اُس زمانے کے چلن کو ذہن میں رکھتے ہوئے، عیسیِ مہرباں اور دعویِ وفا (وغیرہ) کو ترجیح دوں گا، اور مفرد صورت میں دعویٰ، فتویٰ، عیسیٰ، لیلیٰ (وغیرہ) لکھوں گا۔

(۱۱) کیونکے۔ کیونکہ:

یہ دو مختلف کلمے ہیں۔ ''کیوں کہ'' میں ''کہ'' بیانیہ ہے۔ ''کیونکے'' دوسرا کلمہ ہے جو ''کیوں'' اور

''کے'' سے مرکّب ہے۔ یہ ''کیونکر''[1] کی محرّف صورت ہے۔ ''کر'' محرّف صورت میں ''کے'' بن جاتا ہے، جیسے: آکر، آکے۔ جاکر، جاکے، لاکر، لاکے (وغیرہ)۔ اِسی طرح کیونکر، کیونکے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے لکھا ہے:

> ''کیونکر کی جگہ اگلے وقتوں میں ''کیونکے'' بولتے تھے اور ے کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے ''کیونکہ'' (کیوں، کہ؛ جس میں ''کہ'' بیانیہ ہے) لوگوں نے ''کہ'' اور ''کے'' کے معنوں میں فرق نہ کرکے ''کیونکے'' کو ''کیونکہ'' بنا دیا اور پُرانے اُستادوں سودا، میر، درد، وغیرہ کے دیوانوں میں اصلاح فرمادی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں، تصحیف ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ''کر'' کا قائم مقام ہو تو ''کے''، نہیں تو ''کہ'' لکھا جائے، جیسے: نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی (غالب) مقالہ: ''اردو املا'' مشمولہ مقالاتِ صدّیقی، جلدِ اوّل)۔

کلامِ غالب میں جہاں جہاں ''کیونکر'' کے معنی میں یہ لفظ آیا ہے، وہاں اِسے ''کیونکے'' لکھا جائے، مثلاً:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

بہ یادِ گرمیِ صحبت بہ رنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکے غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

---

[1] کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز = کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز (دیوانِ غالب، نسخہ عرشی، ص ۱۷۳)۔
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے = کیونکر نہ کھائیے، کہ ہَوا ہے بہار کی (ایضاً، ص ۲۵۱)
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے = گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا (ایضاً، ص ۲۸۷)

نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی　　تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن　　اُٹھائے کیونکے یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
(نسخۂ عرشی میں اِن سب شعروں میں ''کیونکہ'' ہے؛ صفحات بالترتیب: ۸، ۱۷۷، ۲۱۴، ۳۰۳)۔

(۱۲)

اَے، پَے (پیاپَے، درپَے) دَے [ع: اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے (غالبؔ)] شَے، قَے، گَے (کَے۔ کیانی خاندان کے ایرانی بادشاہ)، مَے، نَے (بانسری) ہَے، ہَے ہَے (ع: ہَے ہَے، خدا نکردہ، تجھے بے وفا کہوں!) اور اُردو کا لفظ کَے؛ یہ سب دو حرفی لفظ ہیں۔ اِن کے پہلے حرف پر زبر ہے اور اِن کے آخر میں یاے لین ہے، جو صورتاً دراز (ے) لکھی جاتی ہے۔ اِن سب لفظوں کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے، مرزا صاحب کی اردو نظم و نثر میں بھی اور فارسی نظم و نثر میں بھی۔

یہ وضاحت خاص کر یوں کی گئی کہ نسخۂ عرشی میں اِن لفظوں کے املا میں یکسانی نہیں۔ یہ الفاظ مرزا صاحب کی نظم و نثر میں جگہ جگہ آئے ہیں (خاص کر نظم میں) اِس لیے اِن کے املا کا تعیّن ضروری ہے۔ مرزا صاحب کی وہ غزل جس کا مطلع ہے:

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے

اِس غزل میں لَے، نَے، ہَے (نہیں ہے)، دَے، قَے، اَے، کَے (تختِ کَے) کَے (تا بہ کَے) بہ طورِ قافیہ آئے ہیں اور اِن سب کے آخر میں صحیح طور پر ے لکھی ہوئی ہے، نیز ''ہے'' کے سوا باقی لفظوں کے پہلے حرف پر زبر لگا ہوا ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۲۸)۔ لیکن دوسرے مقامات پر اختلافِ املا سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مثلاً: نثارِ گردشِ پیمانہ مَی روزگار اپنا (ص ۱۵)، تشنۂ مَی کے تصوّر میں نگہبانی عبث (ص ۳۳)، دَی نے برباد کیا پیرہنستاں میرا (ص ۲۱)، یک غنچہ سے صد خم مَئے گلرنگ نکالوں (ص ۶۰)، دل گزرگاہِ خیالِ مَی و ساغر ہی سہی (ص ۱۴۴)، جو تو دریای مَی ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا (۱۴۸) بے مَی کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی (۱۴۹) برنگِ موجِ مے خمیازۂ ساغر ہے رم میرا (۱۶)، شمع و گُل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند (۱۹) مینای مَی ہے آبلہ پای نگاہ کا (۱۹)، زور نسبت مَی سے رکھتا ہے نصارا کا نمک (۴۹)، حیف اے ننگِ تمنا کہ پَے عرضِ

حیا (۱۴)، برنگِ نَے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد (۳۷)، درسِ خرام تاکِ خمیازۂ روانی (ص ۹۴)۔ اِن سب لفظوں کے آخر میں ے لکھی جانا چاہیے ہر صورت میں؛ خواہ یہ بہ طورِ مفرد آئیں: دَے نے برباد کیا پیر ہنستاں میرا۔ خواہ اضافی، توصیفی یا عطفی ترکیب کے ساتھ آئیں، جیسے: مَے ونغمہ (جوئے ونغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں) مِے گلرنگ، پَے عرضِ حیا، دریائے مَے۔: ہَے ہَے خدانکردہ تجھے بے وفا کہوں۔ مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب۔ شمع وگل تاکے وپروانہ و بلبل تاچند۔ پہلے حرف پر زبر لگانے کا التزام بجائے خود بہتر ہوگا اور خوب ہوگا۔

(۱۳) و۔ ی ساکن، موقوف:

قواعد کے اِن دو اصطلاحی لفظوں سے تو ہم میں سے ہر شخص واقف ہوگا: ساکن، موقوف۔ ساکن وہ ہے جس سے پہلے حرف متحرک ہو، جیسے: دِلْ۔ موقوف وہ ہے جس سے پہلے حرفِ ساکن ہو، جیسے دال، کہ اِس میں ل موقوف ہے۔ ساکن اور موقوف کی یہ تفریق اگر نظر میں نہ رہے تو جن لفظوں کے آخر میں موقوف حرف ہوتے ہیں (اور یہاں مراد ہے دو حروفِ علت و اور ی سے) اُن کے املا میں غلط نگاری راہ پاسکتی ہے۔

اِس کی وضاحت ایک مثال سے بہتر طور پر ہو سکے گی۔ واو ایک حرف کا نام ہے۔ اِس میں پہلا و متحرک ہے، الف ساکن ہے اور آخری و موقوف ہے (وَاو)۔ اِس کو اگر ''واؤ'' لکھا جائے، تو املا بگڑ جائے گا؛ یوں کہ جو حرف موقوف ہے، وہ ساکن ہو جائے گا (وَاءُو)۔ میں نے کسی کو ''واؤ'' لکھتے نہیں دیکھا۔ سبھی ''واو'' لکھتے ہیں اور صحیح طور پر لکھتے ہیں؛ مگر اِسی قبیل کے جو اور لفظ ہیں، جن کے آخر میں ے یا و موقوف ہے، اُن پر ہمزہ بھی لکھ دیا جاتا ہے، جیسے: گھاؤ، ناؤ، رائے، ہائے؛ حالاں کہ یہ صحیح املا نہیں۔

(الف)۔ پہلے اُن لفظوں کو لیجیے جن کے آخر میں ے ہے اور جزوِ لفظ ہے، جیسے: راے، واے، ہاے، براے؛ کہ اِن میں یاے موقوف ہے۔ مرزا صاحب کا یہ قول نقل کیا جاچکا ہے کہ جن لفظوں میں ے جزوِ لفظ ہو؛ اُس ے پر ہمزہ لکھنا، عقل کو گالی دینا ہے۔ اِس بنا پر یعنی قاعدے کی بنا پر بھی اور مرزا صاحب کے واضح قول کی بنا پر بھی، ایسے لفظوں میں ے پر ہمزہ کسی بھی

صورت میں نہیں لکھا جائے گا، جیسے : رائے، وائے، ہائے، بجائے، ورائے، عقلِ گرہ کشائے، یزدانِ جہاں آرائے، آئینۂ حق نمائے، حیرت افزائے۔

وائے، گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ وھاں ہو جائے گا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ　　ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ماہمائے گرم پروازیم، فیض از ماجوئے　　سایہ، ہمچو دود، بالا میرود از بالِ ما

گوئی، وفا ندارد اثر، ہم بہا گرائے　　زیں سادگی کہ دل بہ اثر بستہ ایم ما

مُردم ز فرطِ شوق و تسلّی نمی شوم　　یارب! کجا برم لبِ خنجر ستائے را

(ب)۔۔وہ لفظ جن کے آخر میں موقوف واو ہے، اُس واو پر بھی (یائے موقوف کی طرح) ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے اُلجھاو۔ راو، مہاراو، لکھا ہے (پہلے حصے میں یہ لفظ آچکے ہیں)۔ وہی اصول کہ (الف) مرزا صاحب نے اِس طرح لکھا ہے، یا یہ کہ اِس طرح بھی لکھا ہے (ب) اور یہ کہ قواعدِ املا کے لحاظ سے بھی یہ صحیح (یا مرجّح) صورت ہے۔

یہ بات ہمارے سامنے ضرور رہنا چاہیے کہ بنانا، لگانا، جمانا جیسے مصدروں سے فعل بنیں گے، تو اُن میں واو پر ہمزہ ضرور لکھا جائے گا، جیسے: قلم بناؤ، پان لگاؤ (وغیرہ)۔ (اِن کی دوسری صورت: بنائے، لائے، لگائے۔ اور بنائی، لگائی، لائی وغیرہ) اِن سب صورتوں میں واو ساکن ہوتا ہے (لاءُوْ، لگاءُوْ)۔

ایسے مصدروں سے جو حاصل مصدر بنتے ہیں، اُن میں واو پر ہمزہ نہیں آتا، جیسے: بناو، لگاو، جماو، گھماو۔ اِن میں واو موقوف ہوتا ہے (بناو = بَ نَ اُوْ۔ لگاو = لَ گ اُوْ)۔ اِن میں الف اور واو کے درمیان ہمزہ آ ہی نہیں سکتا۔

لاکھوں لگاو، ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں

اِس شعر میں اگر لگاؤ اور بناؤ لکھا جائے تو اِن لفظوں کے معنی ہی بدل جائیں گے کہ یہ لفظ جو اِس شعر میں حاصل مصدر کے طور پر آئے ہیں، فعلِ امر بن جائیں گے۔ جیسے ''لاکھوں بناؤ''

تو اِس کے معنی ہوں گے (مثلاً) لاکھوں باتیں بناؤ اور یہاں یہ ''بنانا'' مصدر کا فعلِ امر ہوگا، جب کہ اِس شعر میں ''بناؤ'' اور ''لگاؤ'' بہ طورِ فعل نہیں آئے ہیں، بہ طورِ اسم آئے ہیں۔

اِس بات کو بہ طورِ اصول ماننا چاہیے کہ (الف) جس قدر حاصل مصدر اس قبیل کے ہیں، اُن میں واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ (ب) اِسی طرح جتنے لفظوں کے آخر میں یاے موقوف ہے اور وہ جزوِلفظ ہے (جیسے: راے) اُس پر بھی ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔[1]

(۱۴) ہ۔ ھ:

ہاے ملفوظ اور ہاے مخلوط کی کتابت میں مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں وہی عام اندازِ کتابت ملتا ہے، جو اُن کے زمانے میں عام تھا۔ یہی احوال آخرِ لفظ میں واقع ی اور ے کا ہے۔ تلفظ میں معروف و مجہول آواز کا امتیاز کارفرما رہتا تھا اور ہاے ملفوظ و مخلوط کا بھی؛ مگر کتابت میں کچھ فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ مثلاً مرزا صاحب نے قاضی عبدالجمیل جنوںؔ بریلوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ ''تپیدن'' کا ترجمہ ''تڑپھنا'' ہے۔ مزید وضاحت کی ہے: ''باے فارسی اور راور نون کے درمیان ہاے مخلوط التلفظ ضرور ہے'' (خطوطِ غالب، ص ۱۲۱)۔ ایسے جتنے لفظ اُن کی دستی تحریروں میں ملتے ہیں، جن میں ہاے مخلوط التلفظ ہے، اُن سب میں مخلوط ہ کو کہنی دار لکھا گیا ہے؛ اگر وہ درمیانِ لفظ ہے۔ اگر آخرِ لفظ میں ہے، تو کہیں تو سادہ شوشے کے ساتھ لکھا ہے، جیسے: مجہ۔ اور کہیں ایک کہنی دار اور ایک شوشے دار ہ کے ساتھ (یعنی ایک ہ کی جگہ دو لکھی ہیں) جیسے: ساتہہ، ہاتہہ۔ یہ بھی اُس زمانے کی عام روشِ کتابت تھی۔

اِس سلسلے میں یہ بات ہم سب کے ذہن میں ضرور رہنا چاہیے کہ املا اور روشِ کتابت،

۱۔ ''جب دو حرفِ علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں، تو اُن کے بیچ میں ہمزہ آتا ہے، جیسے: آؤ، جاؤ، گیت گاؤ۔ دولہا کے آئے، آپ آئے، میں آؤں تو کیا لاؤں، میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں وغیرہ میں ہمزہ لکھا جائے؛ مگر بناو سنگار، بھاو تاو، نبھاو، گھاو، کڑھاو، میں ہمزہ کا کچھ کام نہیں۔

اِسی طرح گاے، چاے، راے، ہاے، میں بھی ہمزہ نہ چاہیے، اور یہی حال دیو اور سیو وغیرہ کا ہے۔ اِن لفظوں میں الف ے، الف و، یاے و مل کر ایک آواز دیتے ہیں، اس لیے اِن کے بیچ میں ہمزہ کی گنجایش نہیں'' (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی: مقالہ بہ عنوانِ ''اردو املا'' مشمولہ مقالاتِ صدیقی، جلدِ اول، ص ۱۲)۔

یہ دو الگ چیزیں ہیں۔ ''زندگی'' کو اگر ''زندگے'' لکھا گیا، یا ''پوچھ'' کو ''پوچہ''، تو یہ روشِ کتابت ہے جو ایک زمانے میں عام تھی؛ یہ اِن الفاظ کا حقیقی املا نہیں؛ یعنی یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا صاحب ''زندگے'' لکھتے تھے، یا ''ساتھ'' کا املا ''ساتہہ'' مانتے تھے۔ اُس زمانے میں بھی اس طرح لکھتے تھے، یوں کہ یہ عام روش تھی۔

یہ وضاحت خاص کر یوں کی گئی کہ بعض دفعہ اِس سلسلے میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں، جن کو سُن کر ہنسی آتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی میں غالب سے متعلق سمینار ہو رہا تھا۔ ڈائس کے پیچھے دیوار پر مرزا صاحب کے ایک خط کا مکبّر عکس آویزاں تھا (اب بھی ہے)۔ ایک خاصے مردِ معقول نے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مرزا صاحب نے جن لفظوں کو اِس خط میں جیسے لکھا ہے، اُن کو اِسی طرح لکھنا چاہیے۔ ہم اگر یاے معروف و مجہول کی کتابت میں معروف شکل اور مجہول شکل کا امتیاز کریں گے، تو یہ منشاے مصنف کے خلاف ہوگا۔ ایسی باتوں پر اِس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ کہنے والا اِن مسائل سے واقف نہیں، یا پھر یہ کہ تفریحاً او دھ پنچی اندازِ سخن اختیار کیا گیا ہے۔ ایسی باتوں کے پیشِ نظر اِس سلسلے میں، یعنی روشِ کتابت کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری ہے۔

عربی اور فارسی میں ہاے مخلوط ہے نہیں، اِس لیے وہاں ہ کو دو چشمی صورت میں لکھا جائے یا کہنی دار، تلفظ میں فرق نہیں پڑتا۔ کسی طرح لکھیے، تلفظ میں ایک ہی آواز آئے گی، یوں کہ وہاں ملفوظ اور مخلوط ہ کی وہ تقسیم ہی نہیں جو اُردو میں ہے۔ خطّاطی کے واسطے سے یہی روش اُردو میں منتقل ہوئی۔ وصلیاں، خطّاطی کے کمال کی اصل مظہر ہوتی تھیں اور کسی وصلی کو دیکھ لیجیے؛ آپ دیکھیں گے کہ لکھنے والے نے جگہ کی کمی بیشی، جوڑ بند کی خوش نمائی اور لفظوں کی کُرسی پر ساری توجہ مرکوز رکھی ہے اور یہی تقاضاے فن تھا۔

اِسی کی دوسری صورت یہ ہے کہ خطّاطی کے اساتذہ نے خوش خطی سکھانے کے لیے جو رسالے لکھے یا کتابیں لکھیں، اُن میں بھی یہی وصلیوں والا انداز کارفرما رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو میں پریس کے واسطے سے کتابت نے خطّاطی کی جگہ لی، تو وہی سب طور طریق کتابت میں بھی منتقل

ہو گئے جو خطاطی کا لوازمہ تھے۔ خطاطی میں ی اور ے، اِسی طرح ہ یا ھ کی صورت نگاری میں کچھ تفریق نہیں تھی، یہی روش کتابت کے حصّے میں آئی اور اِسی نے عام لوگوں کے اندازِ تحریر میں جگہ پائی۔

ایسا نہیں کہ اُردو میں اِس سلسلے میں کچھ قاعدے قانون بنے ہی نہیں تھے۔ بنے تھے، مگر جلد ہی اُن کو بھلا دیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ نے وہاں کی مطبوعات کے لیے مفصّل نظامِ املا مرتّب کیا تھا (یہ ۱۸۰۱، ۱۸۰۲ء کی بات ہے) جس میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ ی کی معروف (ی) مجہول (ے) اور لین (ے) شکلوں کا تعیّن کیا گیا تھا۔ اِس طرح مخلوط ہ کے لیے بہ طورِ التزام دوچشمی شکل (ھ) متعیّن کی گئی تھی۔ التزام اور اہتمام کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ باغ و بہار میں ایک جگہ متن میں "تمہیں" چھپ گیا ہے؛ غلط نامے میں اُس کی تصحیح کی گئی ہے اور "تمھیں" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ (گل کرسٹ کے نظامِ املا کے لیے دیکھیں مقدّمہ باغ و بہار، مرتبہ راقم الحروف) مگر کتابت[1] کے پھیلاو نے اُن سارے تعینات کو کالعدم قرار دیا اور خطاطی کے پیدا کیے ہوئے عدمِ تعیّن نے برتری حاصل کر لی۔

جیسے اور سب لوگ کسی امتیاز کے بغیر ہ کی مختلف شکلوں کا استعمال کیا کرتے تھے، مرزا صاحب کی دستی تحریریں بھی اُسی عام روش کی ترجمان ہیں۔ پوچہہ، ساتہہ، مجہ، ھی (ہے) وجہ "بہ وجہہ احسن" بہ طورِ عموم ملتے ہیں، اِسی طرح ایسے دوسرے لفظ۔ چوں کہ اب ملفوظ، مختفی اور مخلوط ہ کے لکھنے میں امتیازِ صورت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اِس لیے اب یہ لازم ہوگا کہ مرزا صاحب کے کلام میں مخلوط آواز کو لازماً دوچشمی شکل میں لکھا جائے۔ مختفی ہ کو سادہ شوشے کی شکل میں لکھا جائے، جیسے: نامہ، خامہ، خانہ، نہ (نہیں)، بستہ (وغیرہ) اور ملفوظ ہ خواہ شوشے کی شکل میں ہو ابتدائے لفظ میں (جیسے: ہو) یا درمیانِ لفظ گُھنڈی دار ہو (جیسے: کہنا) یا آخرِ لفظ میں شوشے دار ہو، جیسے: کہنا کا فعلِ امر "کہ" یا سہنا کا فعلِ امر "سہ" یا ماہ کا مخفف "مہ" اُس کے نیچے شوشہ ضرور لگایا

۱۔ کتابت کو کیا کہا جائے، دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ٹائپ میں چھپا ہے، اُس سے کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں: میری قسمت کا نہ اک آدھہ گریباں نکلا (ص ۱۳) بیخبرمت کہ تمھیں بیدرد، خود بینی سے پوچھہ (ص ۱۵)، نہ کہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں (۳۵) اسد مت رکھہ تعجب خرد ماغیہای منعم کا (۷۹) ھمیشہ مجھہ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی (۷۶)۔ جس ٹائپ میں یہ نسخہ چھپا ہے، یہ اُس کا عام اندازِ حروف چینی ہے۔

جائے (جو ہائے ملفوظ کی پہچان ہے اور جس کی بنیاد پر اُسے ہائے مختفی سے مختلف سمجھا جاسکے)۔ ہائے ملفوظ اور مختفی میں امتیاز ضروری ہے۔ میں اس کی مزید وضاحت کرنا چاہوں گا۔ اِس شعر کو دیکھیے:

جوشِ طوفانِ کرم، ساقیِ کوثر ساغر
نـہ فلک آئنہ ایجادِ کفِ گوہر بار

(نسخۂ عرشی، ص۴)

نسخۂ عرشی ٹائپ میں چھپا ہے، اُس میں ''نہ'' اور ''نـہ'' دونوں کو اِسی طرح لکھا گیا ہے۔ ''نہ'' کو ''نـہ'' پڑھا جائے، ''نہ'' نہ پڑھا جائے، اِس کا تعین کس طرح ہوگا؟

یا جیسے یہ مصرع: نہ کہہ، کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں۔ اِس میں ''کہہ'' کو کس طرح لکھا جائے گا۔ اگر ''نہ کہہ'' لکھا جائے، تو اِسے ''کہہ'' نہیں پڑھا جاسکتا، یہ تو ''کہہ'' ہوا، یوں کہ تین حرف ہیں اور ہائے مختفی کا حرفِ ماقبل عموماً مفتوح ہوتا ہے۔ جب تک اِسے ''کہہ'' مع شوشۂ ہائے ملفوظ نہیں لکھا جائے گا، اِس کی صورت نویسی درست طور پر نہیں ہوگی۔

یہ مسئلہ مرتّبِ کلام کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اِسے املا اور تلفظ کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ حوالہ بے محل نہ ہوگا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے لطائفِ غیبی کے متن میں اِس بات کو التزام کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے اور آخرِ لفظ میں واقع ہائے ملفوظ کے شوشے کے نیچے بالالتزام لٹکن (شوشہ) شامل کیا ہے۔ میں شروع کے صرف چودہ صفحوں (ص۱۹۳ سے ص۲۰۶ تک) میں آنے والے ایسے الفاظ درج کرتا ہوں:

متفق علیہ، مابہ النزاع، وجہ، مُنہ، منہ، الیہ، فیہ، بعینہ، کہہ رہا ہے، کہہ سکتا ہے، فقہ، متنبہ، جگہ، الوسیہ (قاطعِ برہان ورسائلِ متعلقہ)۔

''یہ'' کو ہر جگہ اِسی طرح (مع شوشہ) لکھا گیا ہے۔ اگر اِس طریقِ کار کو قبول کرلیا جائے اور اختیار کیا جائے، تو یہ التزام بہتر ہوگا اور صحت سے قریں ہوگا۔

(۱۵) اک۔ایک:

مرتبِ کلامِ غالبؔ کے لیے جو املائی مسائل خاص طور پر توجہ طلب ہیں، اُن میں ''اک'' اور ''ایک'' کا تعین بھی شامل ہے۔ یہ خاصا پریشان کرنے والا مسئلہ ہے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس پر گفتگو کرنے سے پہلے ''ہرایک'' اور ''ہریک'' سے متعلق مرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

مکاتیبِ غالبؔ میں عرشیؔ صاحب نے مرزا صاحب کی بہت سی اصلاحیں بھی شامل کی ہیں۔ اُن میں سے دو اصلاحیں یہاں قابلِ ذکر ہیں۔ نوّاب یوسف علی خاں ناظمؔ کا شعر تھا:

یوں تو ہو جاتا ہے ہرایک عیش و عشرت کا شریک

دوست کہتے ہیں اُسے، جو ہو مصیبت کا شریک

مرزا صاحب نے پہلے مصرعے میں ''ہرایک'' کے الف کو قلم زد کر دیا اور لکھا: جہاں ''ہرایک'' اچھی طرح نہ آئے، وہاں ''ہریک'' لکھیے۔ ''ہرایک'' کیوں لکھیے'' (ص ۱۵۴)۔

اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ وزن کے لحاظ سے اگر ''ہرایک'' (بروزنِ مفعول) مصرعے میں نہ سماپائے، تو اُس کی جگہ ''ہریک'' لکھنا چاہیے، ''ہراک'' نہیں لکھنا چاہیے۔ اِس کی تائید ہوتی ہے ایک اور اصلاح سے۔ نوّاب ناظمؔ کا شعر تھا:

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم رکھتے ہیں ابھی ایک دلِ ہنگامہ گزیں ہم

اِس کے ذیل میں مرزا صاحب نے لکھا: ''یہاں ''ایک'' کی جگہ ''اک'' بے تحتانی درست ہے؛ مگر ''ہر'' کے ساتھ ''ہریک'' ہو، نہ ''ہراک'' (ایضاً)۔

یہاں صاف طور پر ''ہراک'' لکھنے کو منع کیا گیا ہے اور ''ہریک'' کو درست بتایا گیا ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں بہ طورِ عموم ''ہرایک'' اور ''ہریک'' ملتے ہیں۔ اِس سلسلے میں زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ محض اثباتِ مدّعا کے لیے چار اشعار نسخۂ عرشیؔ سے نقل کیے جاتے ہیں:

شب، کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

(ص ۱۴۵)

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ ہر یک عضوِ تن　　جوں چراغانِ دوالی صف بہ صف جلتا ہوں میں

(ص ۶۳)

ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک، وہ کہے　　امیر کلب علی خاں جییں ہزار برس (ص ۲۶۴)

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے (۲۲۸)

نثر میں بھی مرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ اِس کی یہ ایک مثال میرے سامنے ہے۔ مکتوب بہ نامِ نواب یوسف علی خاں ناظم کے ایک جملے میں یہ موجود ہے: ''بہر حال تین چار دن میں ہر یک جگہ سے منگوا کر'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۳۰)۔

اِس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ''ہر اک'' (جس کے لیے ناظم کو واضح لفظوں میں منع کیا گیا ہے) مرزا صاحب نے خود نظم کیا ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

نسخہ عرشی میں ''ہر ایک تیز رو'' ہے (ص ۱۹۰) مگر یہ کسی طرح درست نہیں۔ ''ہر اک'' ہونا چاہیے۔ اگر ''ہر ایک'' لکھا جائے گا، تو مصرع ساقط الوزن ہو جائے گا۔ نسخہ کالی داس گپتا رضا میں ''ہر اک تیز رو'' ہے (ص ۴۱۰)۔

اوپر ''ہر یک'' کی دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی ''ہر یک'' نظم ہوا ہے اور یہ خاص کر قابلِ توجہ ہے:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر یک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

نسخہ عرشی میں ''ہر یک'' ہی ہے (اور نسخہ رضا میں بھی)۔ یہ اِس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ بہت سے لوگ (غلط طور پر) ''ہر اک سے پوچھتا ہوں'' کہتے ہیں۔

اوپر مرزا صاحب کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اُس سے صاف طور معلوم ہوتا ہے کہ ''اک بے تحتانی درست ہے''۔ ہاں مرزا صاحب نے اِس کی تاکید کی ہے کہ ''ہر'' کے ساتھ ''اک'' نہیں لانا چاہیے، ''ہر یک'' لکھنا چاہیے۔ مرزا صاحب کا ایک خاص انداز یہ ہے کہ اُن کے اشعار میں لفظِ ''یک'' خاص طور پر ترکیبی طور پر نظم ہوا ہے، جیسے یہ شعر:

شرر فرصت نگہ سامانِ یک عالم چراغاں ہے

بہ قدرِ رنگ، یھاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

یک عالم چراغاں، یک گلستاں گل، یک جہاں زانو تامّل، یک آسماں ہے مرتبہ پشتِ پا بلند، ہوائے صبح یک عالم گریباں چاکیِ گل ہے، دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں، کس نے (وغیرہ)۔ یہ مرزا صاحب کا خاص اندازِ بیان ہے۔ یک عالم چراغاں، یا یک جہاں زانو تامّل جیسے ٹکڑے فارسی مرکّبات ہیں اور اِن میں ''یک'' ہی آئے گا جو فارسی کا لفظ ہے۔''اک'' (جو اُردو ہے) اِن مرکّب اجزا میں بے جوڑ رہے گا۔ اِس لحاظ سے ایسے ٹکڑوں میں ''یک'' یا ''اک'' کے سلسلے میں کچھ جھگڑا نہیں، اِن میں ''یک'' ہی آئے گا۔

اُلجھن پیدا ہوتی ہے اُن مقامات پر جہاں ''یک'' ایسے طور پر آیا ہے کہ وہ فارسی ترکیب کا حصّہ نہیں۔ اگر وہاں ''اک'' لکھا جائے تو ذرا بھی بے جوڑ نہیں معلوم ہوگا۔ ایسے مقامات پر مرتّب کے لیے یہ خاصی پریشان کن صورت ہوگی کہ وہ کس بنیاد پر ''یک'' لکھے اور ''اک'' نہ لکھے؛ خاص کر یوں کہ مرزا صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے اشعار تو اُس کے سامنے ہیں نہیں۔ اُن کے دیوان کے جتنے اہم اور معتبر نسخے ہیں، وہ سب دوسرں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ پریشان کن صورت یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ ایسے متعدّد اشعار میں ''اک'' لکھا گیا ہے۔ میں نسخہ عرشی سے ایسے کچھ شعر نقل کرتا ہوں۔ پہلے مندرجہ ذیل دو اشعار کو دیکھیے:

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے (۳۳۸)

حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کمیں پایا — اُگی اک پنبہ روزن سے بھی چشمِ سفید آخر (۲۲۱)

''یک مرتبہ'' اور ''اک پنبہ روزن'' میں ''اک'' اور ''یک'' کا تعیّن کس طرح کیا گیا ہے؟ ''اک پنبہ روزن'' کی طرح ''اک مرتبہ'' بھی لکھا جا سکتا ہے۔

اے نورِ چشمِ وحشت، اے یادگارِ صحرا (ص ۲۶) — اے آبلے کرم کر، یاں رنجہ اک قدم کر

نشہ مے ہے، اگر یک پردہ نازک تر ہوا (ص ۲۰) — اے بہ ضبطِ حال خونا کردگاں، جوشِ جنوں

''یک پردہ'' اور ''اک قدم'' میں بہ ظاہر کچھ فرق نہیں ''اک پردہ'' بھی لکھا جا سکتا تھا، یوں کہ ''یک'' یہاں فارسی ترکیب میں تو آیا نہیں، پھر تعیّن کس بنیاد پر ہوگا؟

اِن مصرعوں کو دیکھیے: اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا (ص ۱۶۱)، اک طرف جلتا ہے دل اور

اک طرف جلتا ہوں میں (۶۳) اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے (۲۱۹) آئی یک عُمر سے معذورِ تماشا نرگس (۴۳)۔ اِن میں ''اک گونہ بیخودی'' کی جگہ ''یک گونہ بیخودی'' بھی ہو سکتا ہے اور ''یک عمر'' کی جگہ ''اک عمر'' بھی لکھا جا سکتا ہے؛ اِن میں ''یک'' اور ''اک'' کا تعیّن کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟ ایک مثال اور:

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

(نسخۂ عرشی، ص ۱۴۵)

پہلے مصرعے میں ''ہر یک حلقہ'' تو اِسی طرح لکھا جائے گا، لیکن دوسرے مصرعے میں ''اک دیدۂ بے خواب'' میں ''یک'' کیوں نہیں لکھا جا سکتا؟ ''دیدۂ بے خواب'' فارسی ترکیب ہے اور اِس کی مناسبت سے ''یک دیدۂ بے خواب'' بہتر ہوتا! جس طرح اِس شعر میں ہے:

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بباد　　یادگارِ نالہ یک دیوانِ بے شیرازہ تھا

''یک دیوانِ بے شیرازہ'' اور ''یک دیدۂ بے خواب'' بالکل ایک انداز کے ٹکڑے ہیں۔ یہ کیسے طے ہوگا ایک جگہ ''یک'' لکھا جائے اور دوسری جگہ ''اک''۔

مشکل آساں کُنِ یک خلق، تغافل تا چند (۳۹) سراغِ یک نگہِ قہر آشنا معلوم (۵۴) اِن میں تو تعیّن واضح ہے کہ فارسی تراکیب ہیں، اِن میں تو لازماً ''یک'' آئے گا۔ جہاں اِس انداز کی فارسی تراکیب نہیں، وہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ ''یک'' یا ''اک'' کا تعیّن کس طرح کیا جائے، مثالیں دونوں کی موجود ہیں۔ مرتّب یا مرتّبین کے لیے یہ مسئلہ سوالیہ نشان کی صورت میں رہے گا اور اِس سلسلے میں کسی نہ کسی طرح کی وضاحت ضرور کرنا ہوگی اور اُس وضاحت کی بنیاد پر مرتّب اپنے طریقۂ کار کا تعیّن کرے گا۔ یہ وضاحت اور یہ تعیّن از بس ضروری ہوگا۔

(۱۶) ''ہا'' علامتِ جمع:

فارسی کی علامتِ جمع ''ہا'' کو لفظ سے ملا کر لکھا جائے یا منفصل رکھا جائے، یہ بھی تعیّن طلب ہے۔ یہ مسئلہ یوں خاص طور پر توجّہ طلب ہے کہ مرتّبینِ دیوانِ غالبؔ (اُردو) نے اِس سلسلے میں بڑی

بے پروائی سے کام لیا ہے اور اس بے پروائی کی وجہ سے لفظوں کی عجیب عجیب شکلیں کاغذ پر بن گئی ہیں۔ دیوانِ غالب صدی اڈیشن، مرتبہ مالک رام صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا: ''جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے، اُن کی جمع جب ''ہا'' کے اضافے سے بنائی جاتی ہے، تو اُس ہائے مختفی کو لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ صدی اڈیشن میں ایسے لفظوں میں عموماً علامتِ جمع کو متصل لکھا گیا ہے۔ یہ اُردو کے چلن اور املائے غالب، دونوں کے خلاف ہے... مثلاً: وہ میوہاے تازہ وشیریں کہ واہ واہ = وہ بادہاے نابِ گوارا کہ ہاے ہاے (ص ۲۰۱) بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہاے گل (ص ۶۷) مجھے دماغ نہیں خندہاے بیجا کا (۳۱)، دل سے اُٹھا لطفِ جلوہاے معانی (۱۳۵) ہم گر صلح کرتے پارہاے دل نمکداں پر (۵۵) تمھارے آئینہ اے طرّہ ہاے خم بہ خم آگے (۱۴۰) تالیف نسخہاے وفا کر رہا تھا میں (۱۵) سرگرمِ نالہاے شرربار دیکھ کر (۵۳) ڈرنالہاے زار سے میرے، خدا کو مان (۹۱) میں اور اندیشہاے دور و دراز (۶۱) نکتہاے خرد فزا لکھیے (۱۹۷)'' (ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ ص ۲۰۳)۔ اِس کے تحت یہ حاشیہ بھی لکھا گیا تھا:

> ''عرشی صاحب نے کلامِ غالب کے مخطوطۂ رام پور کے مختصاتِ املا کے ذیل میں لکھا ہے: ''ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کی جب ''ہا'' سے جمع بنائی ہے، تو پہلی ہ بالالتزام لکھی ہے۔ اور اگر کسی جگہ کاتب سے سہو ہوا ہے، تو غالب نے اپنے قلم سے اُس غلطی کی اصلاح کر دی ہے۔ چناں چہ اس نسخے میں خندہ ہا، بادہ ہا، میوہ ہا وغیرہ ملے گا، جب کہ دوسرے نسخوں میں اِس کی خلاف ورزی بھی نظر آئے گی (نقوش (لاہور) نومبر ۱۹۶۴ء)''۔

مرزا صاحب کی جو دستی تحریریں (عکسی صورت میں) پیشِ نظر ہیں، اُن میں اُن لفظوں میں ''ہا'' کو الگ ہی لکھا گیا ہے جن کے آخر میں ہائے مختفی ہے، مثلاً: ''افروزندہ گرمابہ ہاے بغداد شد''

(مکتوب بہ نامِ مولوی ضیاء الدین خاں۔ عکس: غالب کے خطوط، ص ۱۴۱۷)۔ ''صیغہ ہاے امر کے مابعد'' (ایضاً)۔ ''صیغہ ہاے امر کے آگے'' (ایضاً)۔

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں بہ طورِ عموم اِسی طریقِ کتابت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایسے مقامات بہت ہیں، محض بہ طورِ مثال چند حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں: نالہ ہاے زار (۱۸۴) نغمہ ہاے غم (۱۷۹) طرّہ ہاے خم بخم (۲۲۸) جلوہ ہاے معانی (۲۰۸) نالہ ہاے شرر بار (۲۲۵) نالہ ہاے بلبلِ زار (۲۱۳) عنایت نامہ ہاے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں (۶۲)۔

(ہاں، یہ صراحت ضروری ہے کہ اِن سب (اور ایسی دوسری) مثالوں میں نسخۂ عرشی میں اور انتخابِ غالب میں اضافت کی علامت کے طور پر ''ی'' لکھی ہوئی ہے)۔ نسخۂ عرشی میں مجھے صرف ایک جگہ اِس طریق کے خلاف کتابت (یعنی کمپوزنگ) ملتی ہے: نفس در سینہای ہمد گر رہتا ہے پیوستہ (ص ۲۷)۔ اِس کے متعلق یہی کہا جائے گا (اور یہی خیال کیا جانا چاہیے) کہ یہاں کمپوزنگ کی کرشمہ کاری ہے کہ ''سینہ ہاے ہمدگر'' کی جگہ ''سینہای ہمد گر'' کمپوز ہو گیا۔

لفظ کے آخر میں الف یا واو ہو، یا ایسا ہی کوئی اور حرف ہو جو منفصل رہتا ہے، جیسے: گفتگو، مدّعا، نظر، درد (وغیرہ) تب تو علامتِ جمع ''ہا'' منفصل ہی رہتی ہے۔ اِس میں تو کچھ جھگڑا نہیں۔ اختلافِ کتابت نمایاں ہوتا ہے ایسے لفظوں میں جن کے آخر میں ایسے حرف ہوتے ہیں جن کو ''ہا'' سے ملا کر لکھا جاسکتا ہے۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں دونوں صورتیں ملتی ہیں، مثلاً نوّاب یوسف علی خاں ناظم کے نام ایک خط میں مندرج ایک ہی مصرعے میں اس اختلاف کو دیکھا جاسکتا ہے: ''کس کس عنایت کا سپاس ادا کروں گا شکر نعمتہاے تو چندانکہ نعمت ہاے تو'' (عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۲۳)؛ مگر بیش تر مرزا صاحب نے ''ہا'' کو منفصل لکھا ہے۔ مثلاً تفتہ کے نام ایک خط کا عکس خطوطِ غالب میں شامل ہے (ص ۶ کے مقابل) اُس میں ایسے پانچ مرکبات آئے ہیں اور پانچوں مرکبات میں ''ہا'' منفصل ملتا ہے: زندگانی ہا (تین بار) جانفشانی ہا، آمال ہا۔

مکتوب بہ نامِ سید سجّاد مرزا میں ایک جگہ ''ہا'' سے مرکب اسمِ جمع آیا ہے اور وہاں مرزا صاحب نے اُسے ملا کر لکھا ہے: ہر لحظہ دارم نیّتے چوں قرعہ رمّالہا (عکس: غالب کے خطوط،

ص ۸۱۴)۔ سندِ جانشینی بہ نامِ علائی میں ایک جملے میں ایسا مرکب آیا ہے اور وہاں مرزا صاحب نے ''ہا'' کو منفصل لکھا ہے: ''با ایں ہمہ از در بایست ہاے ایں کار آموختنِ فرہنگ است'' عکس: مرقعِ غالب، ص ۲۰۹)۔ غلام غوث بیخبر کے نام مکتوب میں ''پرسش ہاے دوستانہ'' لکھا ہے۔ ''دراں کوشند کہ مہر ما روز افزوں و دوستی ہا دیریں گردد'' (مکتوبِ غالب بہ نامِ نامعلوم۔ عکس: نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل)۔ بہ کثرتِ مشق و فراوانی ورزش و پیروی راہروان راہ داں کشایش ہا روے خواہد نمود'' (مکتوب بہ نامِ جنون بریلوی۔ عکس: ایضاً)۔

اِن مثالوں کے پیشِ نظر یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے ایسے مرکبات میں بیش تر ''ہا'' کو منفصل لکھا ہے۔ نسخہ عرشی میں ایسے مرکبات میں عموماً ''ہا'' کو ملا کر لکھا گیا ہے، جیسے: دلہاے حزیں (۲۲۰) شگفتنہا (۲۱۷) بیکسیہای شبِ ہجر (۲۱۲) زبانہاے لال (۲۰۵) غلطیہاے مضامیں (۱۸۱) کاوشہاے مژگاں (۱۸۰) پرسشہاے پنہانی (۲۳۲) کشاکشہاے ہستی (۲۰۶) مہربانیہاے دشمن (۱۶۵) غمہاے نہانی (۲۳۷) شبہاے ہجراں (۲۳۵) ہوسِ فروختنہا، سوختنہا (۱۰)، نقش بندیہاے دہر (۲۱) کو کبہا۔ شبہا، دلہا۔ ساحلہا۔ (۲۳) عیادتہاے طعن آلود، خرابیہاے دل (۲۳)۔

بعض مقامات پر ''ہا'' علامتِ جمع منفصل بھی ملتی ہے، مثلاً: نہیں گرداب، مجز سرگشتگی ہاے طلب ہرگز (۲۶) طرفہ موزونی ہے صرفِ جنگ جوئی ہاے یار (۳۸)۔ لیکن ایسی مثالیں کم تر ہیں۔

مرتبِ کلامِ غالب کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اِس سلسلے میں ایک طریقِ املا کا تعین کر لیا جائے۔ میں ذاتی طور پر اِس کو ترجیح دوں گا کہ بہ طورِ عموم علامتِ جمع ''ہا'' کو منفصل لکھا جائے۔ اِس سلسلے میں یہ بات میرے ذہن میں رہے گی کہ خود مرزا صاحب نے اُردو اور فارسی دونوں میں اکثر و بیش تر ''ہا'' کو منفصل لکھا ہے اور یوں بھی کہ حُسنِ خط کے لحاظ سے مثلاً ''بیکسیہاے شبِ ہجر'' اور ''شگفتنہا'' کے مقابلے میں ''شگفتن ہا'' اور ''بے کسی ہا'' کہیں بہتر ہوگا۔ آخر کوچہ ہا، درد ہا، دلدار ہا، گفتگو ہا، مدعا ہا (وغیرہ) تو لازماً لکھا جاتا ہے۔ اِس طرح یکسانیِ املا کا اچھا فائدہ بھی حاصل ہوگا۔

(۱۷) ہمزہ، ے، ی:

(الف) پہلے حصے میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ آئے، لائے جیسے افعال میں ے پر ہمزہ لازماً لکھا جانا چاہیے (جس طرح لاوے، جاوے (وغیرہ) میں واو لکھا جاتا ہے، اُسی طرح لائے، جائے (وغیرہ) میں ہمزہ لکھا جاتا ہے اور لکھا جانا چاہیے)۔ لائی، پائی، یالاؤ، پاؤ (وغیرہ) میں ہمزہ جس طرح جُزوِ لفظ ہوتا ہے، اُسی طرح لائے، پائے وغیرہ میں بھی جزوِ لفظ ہے؛ ہمزہ کے بغیر یہ افعال مکمل ہو ہی نہیں ہوسکتے۔ نسخہ عرشی میں اِس سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ کہیں ''آئے'' ہے اور کہیں ''آے'' (وغیرہ) تو اُس کی مطابقت اختیار نہیں کی جائے گی۔ ہاں ''لائی'' اور ''لائی'' میں کچھ فرق نہیں؛ مگر اچھا یہ ہوگا کہ یکسانیِ املا کے لحاظ سے ایک طریقِ کتابت کو اختیار کرلیا جائے اور ایسے سبھی افعال میں آخری جُز کو ایک ہی طرح لکھا جائے۔ اگر ''ئی'' کو اختیار کرلیا جائے (مثلاً: لائی، آئی وغیرہ) تو یہ بھی مناسب صورت ہوگی۔ آخر واو کے ساتھ اور یائے دراز کے ساتھ تو کوئی زائد شوشہ شامل کیا نہیں جاتا، یعنی ''لاؤ'' لکھتے ہیں، ''لائو'' نہیں لکھتے۔ اِس طرح ''لائے'' لکھتے ہیں، ''لائے'' نہیں لکھتے؛ اِس کے انداز پر ''لائی'' یقیناً مرجّح صورت ہوگی۔ بہ ہر طور، ''لائی'' اور ''لائی'' میں صحتِ املا کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں۔ محض یکسانیِ املا کے لحاظ سے کسی ایک صورت کا تعیّن کیا جاسکتا ہے۔

(ب) پہلے حصے میں یہ بات زیرِ بحث آچکی ہے کہ ''آرایش'' کی طرح کے جو حاصل مصدر ہیں، اُن میں ش سے پہلے ی ہوتی ہے، اُن کو ہمزہ کے ساتھ نہیں لکھا جانا چاہیے۔ مثلاً آرائش، آزمائش (وغیرہ) صحیح املا نہیں ہوگا۔ صحیح املا ہوگا: آرایش، آزمایش، فرمایش، ستایش، نمایش، گشایش، بخشایش، گنجایش۔

حاصل مصدر فعلِ امر سے بنتا ہے (مرزا صاحب کی صراحت کے مطابق) کہ امر کے آخر میں ش کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: سوختن، سوزد، سوز، سوزش۔ رفتن، رود، رَو، رَوِش۔ خواستن، خواہد، خواہ، خواہش (وغیرہ)۔ اِس طرح آراستن، آراید، آرای، آرایش۔ آزمودن، آزماید، آزمای، آزمایش (وغیرہ)۔ ہمزہ کے لیے گنجایش ہی نہیں، جگہ ہی نہیں۔

یہی احوال اسمِ فاعل کا ہے کہ وہ بھی فعلِ امر سے بنتا ہے ''ندہ'' کے اضافے سے۔ جس امر کے آخر میں یاے تحتانی ہوگی، اُس سے بننے والے اسمِ فاعل میں بھی وہ یؔ برقرار رہے گی، ہمزہ کی وہاں بھی گنجایش نہیں۔ جیسے: آمدن، آید، آے، آیندہ۔ ستاید، ستاے، ستایندہ۔ نماید، نماے، نمایندہ۔ گشاید، گشاے، گشایندہ۔

اِس طرح اسمِ مصدر اور اسمِ منسوب جو بنیں گے، اُن میں بھی یؔ برقرار رہے گی، جیسے: نمایشی، آرایشی، فرمایشی، آزمایشی۔ نمایندگی، کشایندگی، پایندگی (وغیرہ)۔

اِس طرح ایسے دوسرے الفاظ، جیسے: ہمسایہ، ہمسایگی، ہمسایگاں۔ فرومایہ، فرومایگی، فرومایگاں۔ ہم پایہ، ہم پایگی۔ کم مایہ، کم مایگی، کم مایگاں۔ جایداد، پایدار، رویداد، پایمال (پاے۔ مال)۔ جایگاہ، پایگاہ، سایبان، نمایش گاہ، پاے بند (پابند)، بایدوشاید، بہ قدرِ بایست۔ گریہ، گریے کو (بسملِ دردِ خفتہ ہوں، گریے کو ماجرا سمجھ (نسخۂ عرشی، ص ۳۷)۔ رایگاں، رایگانی (کہ داند از زشے نبود متاعِ رایگانی را (انتخاب، ص ۶)۔

مرزا صاحب کے اردو فارسی کلامِ نظم و نثر میں اِن سب لفظوں کو (اور ایسے دوسرے لفظوں کو) لازماً یؔ کے ساتھ لکھا جائے گا؛ اُن کے لکھے ہوئے قواعد کے مطابق (پنج آہنگ)، اور یوں بھی کہ اُنھوں نے ایسے اکثر لفظوں کو خود بھی اِسی طرح لکھا ہے۔

(ج) مرزا صاحب نے ایک خط میں ہمزہ اور یاے تحتانی سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس میں اِس سلسلے کی بہت سی تفصیلات سما گئی ہیں۔ یہ بہت اہم بیان ہے۔ کلامِ غالب کی تدوین کے ذیل میں اور صحتِ املا کے عام طریق کے سلسلے میں بھی اِس کی حیثیت بنیادی بیان کی ہے:

> ''یاد رکھو، یاے تحتانی تین طرح پر ہے: جزوِ کلمہ، مصرع: ہماے برسرِ مرغاں ازاں شرف دارد۔ مصرع: اے سرِ نامہ نامِ تو عقلِ گرہ کشاے را۔ یہ ساری غزل، اور مثل اِس کے جہاں یاے تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے؛ اِس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے، صرف اضافت کا کسرہ ہے؛ ہمزہ وہاں بھی مُخل ہے، جیسے: آسیاے چرخ، یا آشناے قدیم۔۔ توصیفی، بیانی؛ کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فداے تو شوم، رہ نماے تو شوم؛ یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری، دو طرح پر ہے: یاے مصدری، اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح: توحید و تنکیر، وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: آشنائے، یعنی ایک آشنا، یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھوگے، دانا نہ کہاؤگے"۔

(مکتوب بہ نام تفتہ۔ خطوطِ غالب، ص ۲۴)

اِس بیان کے پہلے حصے میں یہ کہا گیا ہے کہ جو یاے تحتانی جزوِ لفظ ہوتی ہے، اُس پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے، جیسے: راے، واے، ہاے، براے، بجاے، سراے، سواے، داستان سراے، عقلِ گرہ کشاے، بازوے زور آماے۔ اِس ے پر ہمزہ لکھنا، مرزا صاحب کے الفاظ میں عقل کو گالی دینا ہے۔

ایسے لفظوں کو مرزا صاحب نے خود بھی اِسی طرح (ہمزہ کے بغیر) لکھا ہے۔ نسخۂ عرشی اور انتخابِ غالب میں بھی اِسی طریقِ املا (یا یوں کہیے کہ صحیح املا) کی پابندی کی گئی ہے۔ چوں کہ بہ طورِ عموم ایسے لفظوں کا یہی املا ملتا ہے، اِس لیے زیادہ مثالیں درج کرنے کی ضرورت نہیں؛ محض یکسانیِ طریقِ کار کے لحاظ سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں: "سواے ایک شخص کے" (عکس: خطوطِ غالب، ص ۲۹۷)۔ ہنگامہ بیفزاے کہ پرسش بہ سزا نیست (انتخابِ غالب، ص ۳۲)۔ ماہُماے گرم پروازیم، فیض از ما مجوے (ایضاً، ۵) گوئی وفا ندارد اثر، ہم بما گراے (ایضاً، ۸) بہانہ جوے مباش و ستیزہ کار بیا (ایضاً)۔ دل تاب ضبطِ نالہ ندارد، خداے را = از ما مجوی گریۂ بی ہای ہای را (۲۱)۔ غالب زگرفتاریِ اوہام بروں آے (ایضاً ۶۵)۔ آسماں و ہمت، از برجیس و کیوانش

مگوے (ایضاً ۶۶)۔ وائے اگر عہد استوار نہیں ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۰۸) ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے (ایضاً)۔ اے وائے غفلتِ نگہِ شوق، ورنہ یاں (''یاں'' مطابقِ نسخۂ عرشی۔ صحیح: یہاں)۔ ماہ کو درِ تسبیح کواکب جائے نشینِ امام کیا (ایضاً ۲۷)۔ پرِ طاؤس سے دل پائے بہ زنجیر آیا (ایضاً ۲۷)۔

(۱۸) اِس بیان کے دوسرے حصّے میں اضافت کے سلسلے میں نہایت اہم قاعدے کو بیان کیا گیا ہے کہ اضافت کے تحت آخرِ لفظ میں واقع یائے تحتانی پر کسی بھی صورت میں ہمزہ نہیں آئے گا۔ اِس سلسلے میں ضروری تفصیل درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ املا کی بہت سی غلطیاں اضافت ہی کے تحت شاملِ عبارت ہو جاتی ہیں، اور اِس لحاظ سے مرزا صاحب کی اُردو فارسی نظم و نثر کے اکثر شائع شدہ متن تصحیح طلب ہیں؛ بالتخصیص اُردو نثر پر مشتمل متن، کہ مرتّبین کی لاعلمی یا پھر بے پروائی کی وجہ سے ایسے محلِ نظر مقامات اُن میں بہت ملتے ہیں۔ ایسے مقامات پر لفظوں کی صورتیں واضح طور پر مرزا صاحب کے بیان کیے ہوئے طریقِ املا کے خلاف رُونما ہوئی ہیں، اور یہ مرزا صاحب کے طریقِ کتابت سے ذرا بھی مطابق نہیں رکھتیں۔ وجہ ایسی غلط نگاریوں کی یہی ہے کہ مرتّبین نے عموماً اِس سلسلے کی املائی تفصیلات کو پہلے مرتّب نہیں کیا، اِس کو قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھا۔

(الف) مرزا صاحب نے یہ بات صاف لفظوں میں لکھی ہے کہ جو ے مضاف ہوگی (وہ خواہ توصیفی ہو، بیانی ہو، اضافی ہو) اُس پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ اِس کے مطابق قاعدہ یہ ہوگا کہ جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے اور اُن کو ترکیبِ اضافی کے ساتھ لایا جاتا ہے؛ ایسے لفظوں کے آخر میں اضافت کی علامت کے طور پر ے کا اضافہ کیا جائے گا اور یہ مان لیا جائے گا کہ یہ ے مکسور ہے: اضافت کا زیر اِس کے نیچے نہیں لگایا جائے گا اِس بنا پر کہ اِس ے کی حیثیت خود ہی علامتِ اضافت کی ہے۔ اِس کے ساتھ ایک اور علامتِ اضافت (زیر) کا لانا قطعاً ضروری نہیں، مناسب بھی نہیں؛ ایک اضافت کے لیے دو علامتیں کیوں ہوں۔ جیسے: ابتدائے عشق، انتہائے شوق۔

مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں اِسی طریقِ املا کی پابندی ملتی ہے۔ نسخہ عرشی اور انتخابِ غالب میں بھی یہی طریقِ املا ملتا ہے۔ صرف کچھ مثالیں: خطاے بزرگاں (عکس: خطوطِ غالب، ص٦ کے مقابل)۔ اجزاے پنسن (ایضاً)۔ ابناے روزگار (ایضاً)۔ حکماے یونان (عکس: غالب کے خطوط، ص١٤٧)۔ دعاے درویشانہ (ایضاً ٤٢٦)۔ عصاے پیر بجاے پیر (ایضاً ٢٤٣)۔ پاے صد موج بہ طوفاں کدۂ دل باندھا (نسخہ عرشی، ص١٤)۔ فضاے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا (ایضاً ١٢)۔ اگر آسودگی ہے مدّعاے رنجِ بیتابی (ایضاً ١٥) پرافشاں ہے غبار آں سوے صحراے عدم میرا (ایضاً ١٦) دیکھی وفاے فرصت و رنجِ نشاطِ دہر (ایضاً ١٧)۔ رسواے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم (٢٢٩)۔ صرفِ بہاے مے ہوئے آلاتِ مے کشی (ایضاً)۔ عصاے خضرِ صحراے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا (ایضاً ١٨)۔ سرِ منزلِ ہستی سے ہے صحراے طلب دور (ایضاً ٢٩) کیجے آہوے ختن کو خضرِ صحراے طلب (ایضاً ٣٨) ماہماے گرم پروازیم (انتخابِ غالب، ص٤)۔ اداے ملال (ایضاً ١٥٥) بہ تماشاے تو (٤٢) سراپاے تو (ایضاً ٤٤) مرغزارہاے ختا و ختن (ایضاً ٤٦) پاے شکستہ (٤٧) دیدہ ہاے خلق (ایضاً ٣٣) پنبۂ سرِ میناے بادہ (ایضاً ٣٦) سرتاپاے ما (ایضاً ٤١) لابہ ہاے مہر فزا (ایضاً ٤٠)۔ بندِ قباے یار (اسد! بندِ قباے یار ہے فردوس کا غنچہ = اگر وا ہو، تو دکھلادوں کہ یک عالم گلستاں ہے (نسخہ عرشی، ص٨١)۔

(ب) جن لفظوں کے آخر میں واوِ معروف ہوتا ہے (اور وہ شاملِ تلفظ بھی ہوتا ہے) اضافت کی صورت میں اُن کے آگے بھی ے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ ے بھی علامتِ اضافت کے طور پر آتی ہے؛ نہ اِس کے اوپر ہمزہ لکھا جائے گا اور نہ نیچے زیر لگایا جائے گا، یوں کہ یہ تو خود ہی علامتِ اضافت ہے۔ چند مثالیں: ازروے کشف (عکس: غالب کے خطوط، ص٢٥٧)۔ ازروے دہلی اردو اخبار (ایضاً ٢٧٧) پھر وہ سوے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے (نسخہ عرشی، ص٢٨) پرافشاں ہے غبار آں سوے صحراے عدم میرا (١٦) نصیبِ آستیں ہے حاصلِ روے عرق آگیں (٢٨) شب کہ تھا نظارگی روے بتاں کا اے اسدؔ (٣١) جوں بوے غنچہ یک نفسِ آرمیدہ کھینچ (٣٦)۔ اے عدوے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ (٣٣) کہ داغِ آرزوے بوسہ دیوے گا

پیام اُس کا (۲۴) موے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا (۱۱) رہے ہے یوں گہ و بے گہ، کہ کوے دوست کو اب (۲۴۷)۔ چار سوے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے (۴۸)۔ آں خوے خشمگین و اداے ملال کو (انتخابِ غالب، ص ۱۵۵)۔ از حیا روے بما گر نہ نماید چہ عجب (۲۷) بہ بیمِ خوے خودم در عدم بخوابانی = بذوقِ روے خودم در جہاں بگردانی (۱۶۸)۔ برسرِ کوے تو بیخود گشتنم از ضعف نیست (۱۷۱)۔

(ج) ایسے الفاظ کی ایک صورت اور ہے۔ لفظ کے آخر میں معروف واو ہے، مگر مصرعے میں وہ اِس طرح آیا ہے کہ وزنِ شعر کے لحاظ سے واو شاملِ تلفظ نہیں رہا۔ عام طور پر اضافی ترکیبوں کی صورت میں ایسے لفظوں میں بھی ے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ نسخۂ عرشی میں بھی اِسی طریقِ املا کو اختیار کیا گیا ہے، جیسے: جز بہرِ دست و بازوے قاتل دعا نہ مانگ (ص ۵۰)۔ نافہ دماغ آہوے دشتِ تتار ہے (۲۱۷)۔ میں دشتِ غم میں آہوے صیّاد دیدہ ہوں (۲۹۹)۔ اگر ابرِ سیہ مست از سوے کہسار ہو پیدا (۳۱) عکسِ چشمِ آہوے رم خوردہ ہے داغِ شراب (۳۱)۔

یعنی آہوِ رم خوردہ اور بازوِ قاتل نہیں لکھا گیا؛ آہوے رم خوردہ اور بازوے قاتل لکھا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِسی املا کو اختیار کیا جائے اور ایسی صورتوں میں بھی اضافت کے لیے ے کا اضافہ کیا جائے۔ اِس کی پھر وضاحت کی جاتی ہے کہ اِس ے پر، جو بہ طورِ علامتِ اضافت آتی ہے، ہمزہ نہیں لکھا جائے گا اور نہ اُس کے نیچے اضافت کا زیر لگایا جائے گا۔

(د)

ایسے لفظ جن کے آخر میں واو ساکن ہے اور حرفِ ماقبل پر زبر ہے، جیسے: پَرتَو، رہ رَو، خُسرَو، پیرَو؛ یا ایسے لفظ جن کے آخر میں واو موقوف ہے، جیسے سَرو؛ اضافت کی صورت میں بہ طورِ عموم ایسے لفظوں کے آگے یاے علامتِ اضافت نہیں لکھی جاتی، اُسی واو کے نیچے اضافت کا زیر آتا ہے۔ نسخۂ عرشی اور انتخابِ غالب، اِن دونوں میں بھی اِسی عام طریقِ کتابت کو اختیار کیا گیا ہے، جیسے: مصرع سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب (نسخۂ عرشی، ص ۳۲)۔ پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم (۱۷۵)۔ اے پرتوِ خرشید جہاں تاب، اِدھر بھی (۲۱۹)۔ بہار در گروِ غنچہ شہر جولاں

ہے(۵۳)۔ خسروِ انجم کے آیا صرف میں (۱۳۹)۔ ہو جو بلبل پیرِ وفکرِ اسد (۱۵۱)۔ گر انبہاست رختِ رہروِ آلودہ داماں را (انتخابِ غالب، ص ۲)۔ گلفشاں کردصبا سروِ خراماں ترا (۲۴)۔

یہی طریقِ کتابت مرجّح حیثیت رکھتا ہے۔ کلامِ غالب کی تدوین میں بالتخصیص اور عام تحریروں میں بہ طورِ عموم اسی کو اختیار کیا جانا چاہیے۔

(۵)

جن لفظوں کے آخر میں یاے معروفِ ساکن جزوِ لفظ ہوتی ہے، جیسے: غنی، نبی، ولی؛ یا اضافی ہوتی ہے، جیسے: خسروی، ویرانی، بیدلی، عاشقی؛ یا کسی لاحقے کا جزو ہوتی ہے، جیسے: نغمگی، ثمرفشانی، توانائی، طرب فزائی، واماندگی، عشوہ گری، رعنائی؛ ترکیبِ اضافی و توصیفی کی صورت میں، اضافت کے عام قاعدے کے مطابق، اُس ی کے نیچے علامتِ اضافت کے طور پر زیر لگایا جائے گا۔ اضافت کا عام قاعدہ یہی ہے کہ لفظ کے آخر میں الف، واوِ معروف اور ہاے مختفی کے سوا کوئی بھی حرف ہو؛ اُس حرف کے نیچے اضافت کا زیر آتا ہے، جیسے دلِ عاشق، خواہشِ وصال، ماہِ نخشب، مہِ تاباں، سوءِ ظن، سوءِ ہضم۔ اسی طرح اس ی کے نیچے بھی اضافت کا زیر آئے گا۔ جیسے: زندگیِ فانی، سُرخیِ شفق، رعنائیِ خیال، پیرویِ مغرب، بازی گریِ اہلِ سیاست، واماندگیِ شوق۔ یہ بھی لازم ہوگا کہ اضافت کے اس زیر کو ی کے نیچے لگایا جائے۔ چوں کہ ہمارے یہاں اضافت کے زیر لگانے کو کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا، اِس لیے اِس التزام کی طرف توجہ دلانا از بس ضروری ہے۔

اِس سلسلے میں ایک پہلو وضاحت طلب ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ایسے دو چار مرکّباتِ اضافی و توصیفی بھی ہیں جن میں اُنھوں نے اضافت کے لیے ی پر ہمزہ لکھا ہے؛ مگر ایسے مرکّبات کم، بہت کم ہیں۔ ایسے بیش تر مرکّبات میں اضافت کے لیے ی پر ہمزہ نہیں لکھا۔ اُن کی کچھ تحریروں کے جائزے سے اِس کم تر اور بیش تر کے تناسب کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مرقّعِ غالب میں ص ۱۹۷ سے مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے عکس شروع ہوتے ہیں۔ اس کے پہلے حصے میں ص ۱۹۷ سے ص ۲۳۰ تک مرزا صاحب کی ۳۳

دستی تحریروں کے عکس ہیں۔ اِن تحریروں میں ایسے ۹ مرکبات آئے ہیں اور اِن میں سے کسی ایک مرکّب میں ی پر ہمزہ نہیں ملتا: ظہوریِ مغفور (ص ۲۰۴)، فارسیِ قدیم (۲۱۴) ناسازیِ مزاج (۲۲۸) چگونگیِ آں (۲۰۹) بہ پیرویِ راہ داں (ایضاً) بہ رہنمائیِ من (ایضاً) پیریِ من و برنائیِ خویش (ایضاً) تنومندیِ اندیشہ (ایضاً)۔

نوّاب کلبِ علی خاں کی مدح میں قطعے کا عکس مرقّعِ غالب میں ص ۹۷ پر ہے۔ یہ ساتھ شعر کا قطعہ ہے۔ اِس قطعے میں ایسے دو مرکّب آئے ہیں: ساقیِ مہوش۔ میِ گلنار گوں۔ اِن میں سے پہلے مرکّب میں ''ساقی'' کی ی پر ہمزہ نہیں لکھا۔ دوسرے مرکّب میں ''می'' کی ی پر ہمزہ موجود ہے (میٔ گلنار گوں)۔

نعیم الحق آزاد کے نام ایک خط کا عکس غالب کے خطوط میں ص ۲۵۷ پر ہے۔ اِس خط میں ۲۴ سطریں ہیں۔ اِس میں ایسے تین مرکّب آئے ہیں: گرمیِ ہنگامہ، شوخیِ طبع، آبادیِ مسکن؛ اور اِن میں سے کسی مرکّب میں ی پر ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ سیّد سجّاد مرزا کے نام خط میں ''خوبیٔ دین و دنیا'' آیا ہے (ایضاً ص ۸۱۳)۔ مولانا عباس رفعت کے نام خط کا عکس اِسی مجموعے میں ص ۳۳۷ پر ہے؛ اِس میں ایسا صرف ایک مرکّب آیا ہے: خدمت گزاریِ احباب، اور اِس میں ی پر ہمزہ موجود نہیں۔ نوّابینِ رام پور کے نام مرزا صاحب کے جو خط ہیں، اُن میں سے بیش تر خطوں میں ''ولیِ نعمت'' القاب میں آیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی اِس مرکّب میں ی پر ہمزۂ اضافت موجود نہیں۔ مثلاً مرقّعِ غالب میں نوّاب ناظم کے نام ایسے ۲۹ خط ہیں جن کے القاب میں ''ولی نعمت'' آیا ہے۔ علائی کے نام مرزا صاحب کا ایک طویل خط ہے، اُس میں مرزا صاحب نے اپنی چار غزلیں بھی لکھی ہیں، دو فارسی کی، دو اُردو کی (عکس: غالب کے خطوط، ۳۸۸-۹۰)۔ اِس خط میں ایسی تین ترکیبیں آئی ہیں۔ اِن میں سے ایک مرکّب ''میٔ لعل فام'' میں ی پر ہمزہ ہے اور دو مرکبات: رخشندگیِ ساعد، زبندگیِ یارہ و پرگر میں ی پر ہمزۂ اضافت نہیں لکھا گیا ہے۔ نامہ ہایِ فارسیِ غالب میں مرزا صاحب کی ایک عرضی کا عکس شامل ہے۔ اُس میں ایسے سات مرکبات آئے ہیں: ''عمِ حقیقیِ فدوی، مناطِ دعویِ فدوی، زر استمراریِ سرکار، کیفیّتِ منظوریِ آں، دولتخواہیِ و

خیر اندیشی اہالی سرکار جہاندار، عرضی فدوی"۔ اِن ساتوں مرکبات میں کہیں بھی ی پر ہمزۂ اضافت موجود نہیں۔

اِس جائزے میں ایسے کل ۵۵ مرکبات شامل ہیں۔ اِن میں سے تین مرکبات میں ی پر ہمزۂ اضافت لکھا گیا ہے اور ۵۲ مرکبات میں ی پر ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ مرزا صاحب کی جس قدر دستی تحریروں کے عکس میرے سامنے ہیں، اُن کے ایسے سب مرکبات کو یک جا کرلیا جائے، تو یہی تناسب برقرار رہے گا۔ اِس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور دعوا قائم کی جاسکتی ہے کہ اِن مرکبات میں مرزا صاحب کا اضافت کے لیے ی پر ہمزہ لکھنا شاذ کے ذیل میں آتا ہے اور اِس لحاظ سے اصل قاعدے پر اِس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ اصل قاعدہ یہی رہے گا کہ ایسے جملہ مرکباتِ اضافی و توصیفی میں ی کے نیچے اضافت کا زیر لگایا جائے گا، اُس پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ اِس بات کو پھر کہا جاتا ہے کہ اِس ی کے نیچے اضافت کا زیر لازماً لگانا چاہیے۔

(ایک ضمنی بات: اگر یہ کہا جائے کہ اضافت کی صورت میں ی پر ہمزہ ضرور لکھنا چاہیے، تو قائل سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اِس صورت میں (کہ ی پر ہمزۂ اضافت ضروری ہے) تنہائی، رعنائی، زیبائی، برنائی جیسے الفاظ کو بہ صورتِ اضافت کس طرح لکھا جائے گا؟ ایسے سب لفظوں میں آخری حرف ی ہے۔ اُس سے پہلے جو ہمزہ ہے، اُس کا تعلق اِس ی سے نہیں (رعناءی۔تن۔ہا۔ءِی) اضافت کی صورت میں کیا اِسے مثلاً "رعنائی خیال" لکھا جائے گا؟ اگر یہ کہا جائے کہ اضافت کے لیے ی پر ہمزہ لکھنا ضروری ہے، اُس صورت میں تو اِسی طرح لکھنا ہوگا۔ ہاں اگر اصل قاعدے کو مانا جائے کہ اضافت کے لیے ی کے نیچے کسرۂ اضافت آئے گا، تب اِسے "رعنائِ خیال" لکھا جاسکتا ہے؛ جس طرح لکھا جاتا ہے اور جس طرح لکھنا چاہیے)۔

اِسی سلسلے کی دوسری مثال۔ جن لفظوں کے آخر میں ی مشدّد ہوتی ہے، جیسے مرزا صاحب کے اِن مصرعوں میں: گرمئ نبضِ خاروخسِ آشیاں نہ پوچھ۔ بہ شیرینئ خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور۔ کیا اِن مصرعوں میں "گرمئ نبض" اور "بہ شیرینئ خواب آلودہ مژگاں" لکھا جائے گا؟ اگر کوئی صاحب یہ مانتے ہیں کہ اضافت کے لیے ی پر ہمزہ لکھنا چاہیے، تو اُن کے

لیے لازم ہوگا کہ وہ اِن لفظوں کو اسی طرح لکھیں۔ اِن لفظوں کو اور ایسے اور سب لفظوں کو معمول کے موافق (یعنی ''گرمیِ نبض'' اور ''بہ شیرینیِ خواب'') اُسی صورت میں لکھا جاسکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ اضافت کی صورت میں آخرِ لفظ میں واقع ی پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے، بل کہ اُس ی کے نیچے اضافت کا زیر لگانا چاہیے۔ یہ ضمنی بات یہاں ختم ہوئی)۔

نسخۂ عرشی میں بیش تر اسی طریقِ املا کی پابندی کی گئی ہے کہ ایسے مرکبات میں ی کے نیچے اضافت کا زیر لگایا گیا ہے، ی پر ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ میں صرف ایک صفحے (ص ۷۰) پر موجود ایسے مرکبات کی مثالیں نقل کرتا ہوں:

یاں پشتِ چشمِ شوخیِ قاتل ہے آئنہ۔ یارب حسابِ سختیِ خوابِ گراں نہ پوچھ۔ گرمیِ نبضِ خاروخسِ آشیاں نہ پوچھ۔ بیتابیِ تجلیِ آتش بجاں نہ پوچھ۔ دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ۔ حیرت ہجوم، لذتِ غلطانیِ تپش[1] (''غلطانی'' ط کے ساتھ۔ اِس کی بحث حصہ اوّل میں آچکی ہے)۔

(و) جن لفظوں میں یائے معروف موقوف ہوتی ہے، جیسے: سُعْیْ، نَہْیْ؛ اِن میں بھی اضافت کے لیے ی کے نیچے کسرۂ اضافت لگایا جاتا ہے، ی پر ہمزۂ اضافت نہیں آتا۔ نسخۂ عرشی میں بھی اِسی کی

۱۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ انتخابِ غالب میں ایسے مرکبات میں ہر جگہ ی پر ہمزہ ملتا ہے علامتِ اضافت کے طور پر۔ شروع کے ۷ اصفحات سے ایسی مثالیں نقل کی جاتی ہیں: خاموشیِ ماگشت بدآموز بتاں را (ص ۴)۔ تا نامِ تو شیرینیِ جاں دادہ بکفتن (۵)۔ دل خود از تست و ہم از ذوقِ خریداریِ تست (۷)۔ از شبرویِ ماست شکوہِ عسسِ ما (۱۵)۔ گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں (۱۲)۔ درازیِ شبِ ہجراں زحد گزشت، بیا (۱۷)۔ کہ بیقراریِ جوہر نبرد رنگش را (۱۷)۔ اِس کے مقابلے میں دوسرے مرکبات میں ے پر ہمزہ نہیں ملتا، صرف دو صفحوں سے اِس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں: زپیکانہاے ناوک دردلِ گرمم نشاں نبود = بریگستاں چہ جوئی قطرہ ہاے آبِ باراں را (۱۶)۔ بروے شعلہ گرمِ مشقِ جولاں نے سواراں را (۱۶)۔ فداے روے تو عمرِ ہزار سالۂ ما (ایضاً) زسعیِ ہرزہ بہ بیحاصلی علم گشتیم (ایضاً) کدام آئنہ با روے او مقابل شد (ایضاً)۔

نسخۂ عرشی اور انتخاب میں زیرِ بحث مرکبات کے املا میں جو فرق ہے، اِس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ انتخاب پہلے کی تدوین ہے (سالِ طبع: ۱۹۴۲ء) اور نسخۂ عرشی اُس کے بعد کا کام ہے (سالِ طبع: ۱۹۵۸ء)؛ اِس زمانی فرق نے آخر میں ایسے مرکبات کے سلسلے میں صحیح املائی تعین میں مدد کی ہے۔

پابندی کی گئی ہے و بینش بہ سعیِ ضبطِ جنوں نو بہار تر (ص ۴۰)۔ سعیِ خرام، کاوشِ ایجادِ جلوہ ہے (۴۱) خرامِ ناز برقِ خرمنِ سعیِ پسند آیا (ص ۱۲) گر کرے یوں امر بہیِ بوتراب آئینے پر (۴۰)۔

(ز) ایسے الفاظ جن کے آخر میں یاے لیّن (یاے ماقبل مفتوح) ہوتی ہے، جیسے: مَے، پَے، نَے، دَے؛ اِن میں ے جزوِ لفظ ہوتی ہے، اُس ے سے مختلف ہوتی ہے جس کا اضافہ کیا جاتا ہے علامتِ اضافت کے طور پر۔ چوں کہ ے جزوِ لفظ ہوتی ہے، اِس لیے اضافی اور توصیفی ترکیب کی صورت میں اِس کے نیچے کسرۂ اضافت لگایا جائے گا (اس پر ہمزہ نہیں آئے گا) جیسے: مَےِ گل رنگ، پَےِ عرضِ ہنر، ساز پر رشتہ پَےِ نغمہ بیدلؔ باندھا، حیف اے تنگِ تمنا کہ پَےِ عرضِ حیا، پَےِ سنجیدنِ یاراں ہو حالِ خوابِ سنگین کا، مَےِ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے، ضعف سے نقشِ پَےِ مور ہے طوقِ گردن۔

(ح)

آخرِ لفظ میں (جو مضاف ہو یا موصوف ہو) یاے مشدّد آئے تو اُس ی پر تشدید لگانا ضروری ہے۔ مرزا صاحب نے ایسے بیش تر لفظوں میں ی پر تشدید لگائی ہے۔ مثلاً نوابینِ رام پور کے نام بیش تر خطوں میں "ولیِّ نعمت" القاب میں آیا ہے اور اکثر خطوں میں ی پر تشدید لگی ہوئی ہے۔ تشدید کے ساتھ اضافت کا زیر لگانا بھی ضروری ہے۔ نسخۂ عرشی میں اِس ایک مصرعے میں مرکّبِ اضافی کو اِسی طرح لکھا گیا ہے: گرمیِّ نبضِ خار و خسِ آشیاں نہ پوچھ (ص ۰۷) لیکن ایسے دوسرے مرکّبات تشدید اور کسرۂ اضافت کے بغیر ملتے ہیں، جیسے: کیا بیم اہلِ درد کو سختی راہ کا (۱۹) بشیرینی خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور (۲۲) سیہ مستی چشمِ شوخ سے ہیں جوہرِ مژگاں (۲۲) کروں گر عرض سنگینی کہسار اپنی بیتابی (۳۱) تیرگی ظاہری ہے طبعِ آگہ کا نشاں (۳۱) ہے ہوس محملِ بدوشِ شوخیِ ساقی مست (۳۳) پاسبانی طلسمِ گنجِ تنہائی عبث (۳۴) ہے عرق ریزی خجلت جوششِ طوفانِ عجز (۴۴) کیوں نہ طوطی طبیعت نغمہ پیرائی کرے (۴۵) وغیرہ۔

اِن سب مرکّبات میں ی پر تشدید ہونا چاہیے تھی اور اُس کے نیچے اضافت کا زیر (جس طرح "گرمیِّ نبض" میں ہے) یعنی: سختیِّ راہ، بہ شیرینیِّ خواب آلودہ مژگاں، تیرگیِّ ظاہری، سیہ مستیِّ

چشمِ شوخ، سنگینیِ کہسار، تیرگیِ ظاہری، ساقیِ مست، پاسبانیِ طلسمِ گنجِ تنہائی، عرق ریزیِ خجلت، طوطیِ طبیعت۔ ایسے سبھی مرکّبات کو اسی طرح لکھا جانا چاہیے۔

(ط)

دعا اور گفتگو جیسے الفاظ کے ساتھ علامتِ اضافت کے طور پر یاے تحتانی کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: بازوے قاتل، ابتداے شوق۔ اِس یاے علامتِ اضافت کو یاے مجہول (ے) کی صورت میں لکھنا چاہیے، یاے معروف (ی) کی صورت میں نہیں۔ یہ بات خاص کر یوں لکھی گئی کہ نسخہ عرشی میں اِس سلسلے میں اُلجھن میں ڈالنے والی صورتِ حال سامنے آتی ہے، اِس طرح کہ کہیں تو ایسے مرکّبات میں ے ملتی ہے اور کہیں ی۔ اِن چند مثالوں ہی سے اِس کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے: کہ داغِ آرزوے بوسہ دیویگا پیام اُس کا (ص ۲۴) شب کہ تھی کیفیّتِ محفل بیادِ روے یار (۲۵) کیجے آہوے ختن کو خضرِ صحرای طلب (۳۸) جوں جادہ سر بکوے تمنای بیدلی (۴۲) سیرِ آنسوے، تماشا ہے طلبگاروں کا (۲۸) پھر وہ سوے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے (۲۸) نظر آتا ے موی شیشہ رشتہ شمعِ بالیں کا (۲۸) قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوے دشت (۳۴) راہِ خوابیدہ کو غوغای جرس افسانہ تھا (۲۵) پر افشاں ہے غبار آنسوے صحرای عدم میرا (۱۶)۔ (اِس کتاب میں نسخہ عرشی اور انتخابِ غالب سے اِس سے پہلے جو مثالیں نقل کی گئی ہیں، اُن میں میں نے ایسے جملہ مقامات پر ی کی جگہ ے لکھی ہے، تاکہ کسی طرح کی ذہنی اُلجھن نہ پیدا ہو اور املائی دورنگی نمایاں نہ ہو)۔

(ی) اضافت کے لیے ہمزہ صرف ایک صورت میں آتا ہے، جب لفظ کے آخر میں ہاے مختفی ہو، جیسے: نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خورنے (نسخہ عرشی، ص ۲۶) دردِ طلب بہ آبلہ نادمیدہ کھینچ (۳۶) حبابِ چشمہ آئینہ ہووے بیضہ طوطی کا (۲۶) دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہو گیا (۳۰) زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خونچکانی نے (۳۰)۔

(۱۹)

(الف) عطفی ترکیبوں میں ے یا ی پر ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔ یہ متعارف طریقِ کتابت ہے اور

بجاے خود درست ہے۔ نسخۂ عرشی میں بھی اِسی طریقِ املا کو اختیار کیا گیا ہے۔ اِسی کی پابندی کی جانا چاہیے، مثلاً: مے و نغمہ، زندگی و موت، سعی و کوشش، وحی و الہام، ہوسِ ناے و نوش، گوشہا سیمابی و دل بیقرارِ نغمہ ہے (نسخۂ عرشی، ص ۸۶) شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند (۳۹) طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ (۱۹۷) زنہار گر تمھیں ہوسِ ناے و نوش ہے (۲۳۰) جامِ سرشارِ مے و غنچۂ لب ریزِ بہار (۵) نے کوچہ رسوائی و زنجیرِ پریشاں (۶۰)۔

(ب) عطفی ترکیب کی جتنی بھی صورتیں ہیں (محولہ بالا صورتوں کے شمول کے ساتھ) کسی صورت میں بھی واوِ عطف پر یا حرفِ ماقبلِ واو پر ہمزہ نہیں آتا۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں بھی اِسی کی پابندی ملتی ہے اور نسخۂ عرشی میں بھی اِسی متعارف طریقِ املا کی پابندی ملتی ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی جانا چاہیے، مثلاً: ادا و ناز، جفا و وفا، دعا و دوا۔ کعبہ و بت خانہ، غنچہ و گل، نغمہ و آواز، جلوہ و پردہ، خوابیدہ و بیدار۔

اے شب پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب (نسخۂ عرشی ۳۲) گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنا نمکیں (۸) عشقِ تر سا بچہ و نازِ شہادت مت پوچھ (۲۸) میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب (۶۱) سینہ آہنگیِ جستنِ وسعیِ نالہ فرسائی (۶۴) یعنی ہیں ماندہ از آں سو واز یں سو راندہ (۷۱) شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ (۷۲) عکس کجا و کو نظر، نقش کو مدعا سمجھ (۷۳) بے خطِ عجزِ ما و تو اوّلِ درسِ آرزو (ایضاً) پیدا کریں دماغِ تماشاے سرو و گل (۸۲) گوشہا سیمابی و دل بے قرارِ نغمہ ہے (۸۶) پرواز بہ خوں خفتہ و فریاد رسا ہے (۹۱) حیرت حجابِ جلوہ و وحشت غبارِ چشم (۱۰۶)۔

(۲۰)

مرزا صاحب نے بہت سے لفظوں میں حرفِ مشدد پر تشدید لگائی ہے۔ اُن کے زمانے میں تشدید اور اضافت کے زیر لگانا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا (یہ روایت آج تک کارفرما ہے) مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں اضافت کے زیر تو عموماً نہیں ملتے، لیکن تشدید کا اہتمام ملتا ہے۔ میں اِس سلسلے میں ایسے کچھ لفظ درج کرتا ہوں؛ اِس سے یہ اندازہ بہ خوبی کیا جاسکے گا کہ وہ حرفِ مشدد پر تشدید لکھنے کو اہمیت دیتے تھے اور اکثر اِس کی پابندی کرتے تھے۔

بہ طورِ مثال اُن کے تیرہ خطوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) میں تین مکمّل خطوں کے عکس شامل ہیں۔ اِن میں سے ایک خط تفتہ کے نام ہے۔ اِس میں ایسے پندرہ لفظ ہیں جن میں اصلاً حروفِ مشدّد شامل ہیں۔ اِن میں سے بارہ لفظوں میں مشدّد حروف پر تشدید ہے اور تین لفظ تشدید سے خالی ہیں۔ دوسرا خط مجروح کے نام ہے۔ اِس میں ایسے ۱۶ لفظ ہیں جن میں حروفِ مشدّد آئے ہیں۔ اِن میں سے ۶ لفظوں میں متعلقہ حرفوں پر تشدید ہے اور دس لفظ تشدید سے خالی ہیں۔ تیسرا خط جنون بریلوی کے نام ہے۔ اِس میں ایسا صرف ایک لفظ ہے اور اُس پر تشدید موجود ہے۔ مرقعِ غالب میں شامل شروع کے ۱۰ خطوں کے عکس میں (ص ۱۹۷ سے ص ۲۰۶ تک) ایسے کُل پچاس لفظ آئے ہیں، جن میں حروفِ مشدّد ہیں۔ اُن میں سے اڑتیس لفظوں میں تشدید لگی ہوئی ہے اور بارہ لفظ تشدید سے خالی ہیں۔ اِس کو یوں بھی دیکھیے کہ نواب رام پور کے نام اکثر خطوں میں ''ولیِ نعمت'' القاب میں شامل ہے اور بیش تر خطوں کے عکس میں یہ لفظ مع تشدید ''ولیّ نعمت'' ملتا ہے۔

اِس لحاظ سے کہ مرزا صاحب نے بیش تر مشدّد حرفوں پر تشدید لکھی ہے اور یوں بھی کہ تشدید اصلاً شاملِ املا ہے، کیوں کہ تشدید، لفظ کا جز ہوتی ہے، وہ ایک حرف کی تکرار کی علامت ہے اور یوں وہ ایک حرفی کی نمایندگی کرتی ہے؛ مشدّد حرفوں پر تشدید لازماً لگائی جانا چاہیے۔

(۲۱) اضافت کے زیر لگانے کا رواج اُردو، فارسی میں نہیں رہا۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں گل کرسٹ نے اِسے لازم قرار دیا تھا اور اُس کے زمانے کی چھپی ہوئی کتابوں میں اِس کا التزام ملتا ہے، مگر آسان پسندی کی طاقتور روایت نے اِس مفید اور اچھے التزام کو برقرار نہیں رہنے دیا۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں بھی بہ طورِ عموم اضافت کے زیر نہیں ملتے۔ مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی میں اِس کا التزام کیا ہے، پابندی کے ساتھ اضافت کے زیر لگائے ہیں۔ یہ التزام بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اِس سے صحیح خواندگی میں قابلِ قدر مدد ملتی ہے، معانی کے تعیّن میں مدد ملتی ہے اور املا کی تکمیل ہوتی ہے۔ اِن وجوہ سے مرزا صاحب کی اُردو فارسی نظم و نثر میں اضافت کے زیر لگانا چاہیے اور اِس کو لازم قرار دینا چاہیے (اِس کی پابندی تو ہر تحریر میں کی جانا چاہیے)۔

(۲۲) تشدید، کسرۂ اضافت، توقیف نگاری، علامت:

تشدید اور اضافت کا زیر، یہ دونوں اجزا جزوِ کلام ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تشدید تو ایک حرف کی قائم مقامی کرتی ہے، وہ علامت ہے تکرارِ حرف کی؛ اِس لحاظ سے اُس کا لکھنا لازم ٹھہرا۔ عام طور پر لوگ لکھتے ہیں یا نہیں لکھتے، یہ الگ بات ہے۔ عام لوگوں کا احوال تو یہ ہے کہ اُن میں سے بیش تر کے ذہن میں تدوین ہی کی ناگزیر اہمیّت کا کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔

اضافت کا زیر بھی اُس آواز کی نشان دہی کرتا ہے جو متعلقہ حرف کے بطن میں پیدا ہوئی ہے۔ اُردو میں لفظ کا آخری حرف ساکت، یعنی غیر متحرّک ہوتا ہے۔ اضافت کا زیر اُس ساکت حرف کو متحرّک بنا دیتا ہے۔ اِس طرح دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اضافت کے زیر کا شاملِ لفظ ہونا ضروری ہے، یوں کہ وہ اُس آواز، یعنی حرکت کی نشان دہی کرتا ہے۔ صرف نشان دہی نہیں کرتا اُس حرکت کا تعیّن کرتا ہے اور اُس حرکت کے شاملِ تلفظ کیے جانے کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔ اِس اعتبار سے کسرۂ اضافت کو جزوِ لفظ سمجھنا چاہیے اور اِسی وجہ سے اُس کا شامل کرنا لازم ٹھہرتا ہے۔ یہ کہنا کہ عام طور پر اضافت کا زیر لگایا نہیں جاتا، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عام طور پر تو لوگ ہائے ہوّز اور ہائے مخلوط کی صورت نگاری میں بھی امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھتے، تو کیا اِس بنا پر یہ جائز ہو جائے گا کہ مثلاً ''اُنھوں'' کو ''انہوں'' لکھا جائے۔

رموزِ اوقاف اور علامات کی یہ حیثیت تو نہیں، مگر اہمیّت ضرور ہے۔ اِنھیں تدوین کا اہم حصّہ ضرور سمجھا جانا چاہیے۔ مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی میں رُموزِ اوقاف کا اہتمام ملحوظ رکھا ہے، خاص کر ''کاما'' تو اُنھی کے الفاظ میں بہ حدِّ افراط ملتا ہے۔ خیر، بہ حدِّ افراط نہ سہی، دائرۂ تناسب کی مطابقت کے ساتھ ضرور اُسے شامل ہونا چاہیے۔ تدوین کی تکمیل کے یہ خارجی اجزا ہیں اور اِن کو ضرور شامل کیا جانا چاہیے۔ مولوی عبدالحق نے قواعدِ اُردو میں رموزِ اوقاف کی جو تفصیل لکھی ہے، وہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ علامات سے متعلق راقم الحروف کی کتاب اردو املا کو دیکھا جا سکتا ہے، جس میں تفصیل اور ضروری وضاحت کے ساتھ اِن کو یک جا کر دیا گیا ہے۔

(۲۳) اختلافِ املا، سہوِ ذہن، سہوِ قلم:

جن لفظوں کو مرزا صاحب نے روشِ عام کے خلاف لکھا ہے؛ یعنی عام لوگ، یا بہت سے لوگ اُس

طرح نہیں لکھتے؛ اُن کو تین حصّوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(الف)

ایسے لفظ جن کا املا، اکثر لوگوں کے املا سے مختلف ہے۔ غلط نہیں، مختلف ہے۔ (کسی بات کا غلط ہونا، اور کسی بات کا دوسروں کے مختارات سے مختلف ہونا؛ یہ دو الگ چیزیں ہیں، اِنھیں ایک خانے میں نہیں رکھا جاسکتا)۔ اِس طریقِ کار کو بہ طورِ اصول مان لینا چاہیے کہ ایسے سبھی لفظوں کو مرزا صاحب کی نظم و نثر میں اُسی طرح لکھا جانا چاہیے جس طرح مرزا صاحب نے اُن کو لکھا ہے، یا جس طرح صحیح بتایا ہے۔، جیسے: سونگھنا، پچھتانا، تڑپھنا (وغیرہ)۔ یا جیسے ذ اور زے کی بحث (گزشتن، گزاشتن، پزیرفتن کے مشتقات کا املا) یا جیسے خرشید اور خور کی بحث، یا ''واں'' اور ''وھاں'' کی بحث، یا ت اور ط کی بحث (تشت، غلتیدن کے مشتقات، تپش وغیرہ کا املا)۔ ایسے دوسرے سبھی الفاظ اسی ذیل میں آتے ہیں۔

اِسی ذیل میں وہ انگریزی الفاظ بھی آتے ہیں (خاص نام ہوں یا عام لفظ ہوں) جن کو مرزا صاحب نے اپنے انداز سے (یا یوں کہا جائے کہ اپنے تلفظ کے مطابق) لکھا ہے اور اب اُنھیں اُس طرح نہیں لکھا جاتا۔ ایسے سبھی لفظوں کو مرزا صاحب کے اختیار کردہ املا کے مطابق ہی لکھا جانا چاہیے۔ اِن کے املا میں اگر تبدیلی کی جائے گی، تو اُسے تحریف قرار دیا جائے گا اور ناقابلِ قبول سمجھا جائے گا۔ (یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں کسی خاص روشِ کتابت سے بحث نہیں، یہ املاے الفاظ کی بحث ہے۔ اوپر یہ بحث کی جاچکی ہے کہ املا اور روشِ کتابت، دو مختلف چیزیں ہیں)۔

(ب) ایسے الفاظ، جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا وہ املا، جسے مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے، سہوِ ذہن کے تحت آتا ہے۔ یہ بات تجربے میں آئی ہے کہ کسی بھی وجہ سے، کبھی کسی لفظ یا بعض الفاظ کا وہ تلفظ یا املا ذہن میں بیٹھ جاتا ہے جو درست نہیں ہوتا؛ مگر قلم وہی نقش کاغذ پر بناتا رہتا ہے اور زبان اُس لفظ کو اُسی طرح دُہرانے لگتی ہے۔ مرزا صاحب کی تحریروں میں غلط املا کی مثالیں ملتی ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اِن میں قابلِ ذکر تعداد عربی کے لفظوں کی ہے جو عربی

کے طریقہ، ترکیب کے مطابق استعمال میں آئے ہیں کہ اُن مرکب لفظوں میں ایک الف زائد لکھا گیا ہے، جیسے: باالفعل۔

ایسے لفظوں کے سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ مرزا صاحب کے ذہن میں یہ خیال گردش کرتا رہتا تھا کہ وہ عربی اُتنی نہیں جانتے جتنی جاننا چاہیے۔ اُنھوں نے کئی خطوں میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اُن کے حریفوں میں بیش تر لوگ وہ تھے جو عربی کے عالم تھے یا اُن سے زیادہ جانتے تھے۔ مولانا عباس رفعت نے عربی کا قصیدہ بھیجا تھا، اُن کو لکھتے ہیں: ''قصیدۂ عربی کا کیا کہنا، میں اِس لسان کے غوامض اور قواعد سے اچھی طرح آشنا نہیں'' (غالب کے خطوط، ص ۱۳۱۷)۔ مولوی ضیاء الدّین خاں دہلوی کو طویل خط لکھا ہے، اُس کے شروع ہی میں لکھا ہے: ''جناب مولوی صاحب، میں نے ایامِ دبستاں نشینی میں شرحِ مأۃ عامل تک پڑھا، بعد اُس کے لہو ولعب... میں منہمک ہوگیا'' (ایضاً، ص ۱۴۱۷)۔ مولانا صہبائی کے ایک اعتراض کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے: ''مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدینِ خویش.... گفت، افسوس کہ غالب عربی نمیداند'' (وغیرہ)۔

اُنھوں نے عربی ترکیبوں میں ضرورت سے زیادہ احتیاط برتی اور غالباً اِسی ''زیادہ احتیاط'' کے دباو میں ایک زائد الف قلم سے نکل گیا: ''باالفعل'' (مرقعِ غالب، ص ۲۰۳)۔ ''باالکل'' (ایضاً)۔ ''باالکل'' (ایضاً ۲۲۸)۔ ''بااللہ'' (غالب کے خطوط، ص ۱۴۹۴)۔ ''بااللہ'' (ایضاً، ۱۲۷۲)۔ ''بااللہ'' (ایضاً ۱۴۵۳)۔ ''باالفضل'' (ایضاً)۔ ''مرادف باالمعنیٰ'' (حاشیہ قصیدۂ فارسی، مملوکہ کالی داس گپتا رضاؔ۔ اوپر صہبائی سے متعلق غالب کی عبارت اِسی سے ماخوذ ہے)۔

ایسے سبھی لفظوں کو متن میں صحیح صورت میں لکھا جانا چاہیے اور حواشی میں اِس کی وضاحت کی جانا چاہیے۔ عربی لفظوں میں دو غلطیاں ایسی ہیں جن کا انداز اِن محولہ بالا غلطیوں سے مختلف ہے۔ فارسی کے ایک خط میں جو درحقیقت دستاویز ہے، مرزا صاحب نے مونث کے لیے ضمیرِ مذکر لکھی ہے: ''جناب والدہ صاحب قبلہ و کعبہ حضرت عزت النسا بیگم صاحبہ مدّ ظلّہٗ

العالی'' (عکس: فسانۂ غالب، ص ۳۱)۔ اِس خط کے حاشیے میں مالک رام صاحب نے ایسی دوسری غلطی کی نشان دہی کی ہے: ''یہی غلطی انھوں نے بعد کو ایک قصیدے کے عنوان میں بھی کی ہے... لکھتے ہیں: قصیدۂ برگزیدہ در مدح... ملکۂ معظمۂ انگلستان خلّد اللہ ملکہ بالعدل والاحسان''۔

متن میں اِن الفاظ (ملکہٗ، مدّ ظلّہٗ) کو اِسی طرح رہنا چاہیے، البتہ حاشیے میں وضاحت کی جانا چاہیے۔ مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے جو عکس میرے سامنے ہیں، اُن میں متعدّد مقامات پر ''اللہ'' اور ''الٰہی'' میں مد لکھا ہوا ہے، یعنی: اللّٓہ، الٓہی۔ مثلاً اسد اللّٓہ (مرقعِ غالب، ص ۲۵۷)۔ واللّٓہ (غالب کے خطوط، ص ۱۴۵۱)۔ اسد اللّٓہ (ایضاً ۱۴۵۶)۔ لا اللّٓہ (ایضاً ۱۵۰۵) لا اللّٓہ، (ایضاً)۔ اسد اللّٓہ، (نقوش (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۱۴)۔ الٓہی (مرقعِ غالب، ص ۲۶۳)۔ الٓہی (ایضاً ۲۹۴)۔

عربی کے اِن الفاظ کا یہ املا درست نہیں۔ ہاں، مرزا صاحب نے مد کے ساتھ اِن

۱۔ یہ قصیدہ دستنبو میں شامل ہے (دستنبو، طبعِ اوّل، مطبعِ مفیدِ خلایق، آگرہ)۔

۲۔ حکیم غلام نجف خاں کے نام مرزا صاحب نے ایک خط میں ایسی ہی کسی تحریر سے متعلق لکھا ہے: ''نہ بھائی، یہ نہ سمجھو، ''سلطان'' بہ معنیِ مصدر آتا ہے۔ ''سلطنتہٗ'' اگرچہ من حیث القیاس صحیح ہے، لیکن ٹکسال باہر ہے۔ ''خلّد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ'' لکھتے ہیں۔ منشیانِ ایران و روم و ہند، سب یوں ہی لکھتے آئے ہیں۔ ''ضمان'' بھی بہ معنیِ ضامن اور بھی بہ معنیِ ضمانت، ''سلطان'' بھی بہ معنیِ بادشاہ اور بھی بہ معنیِ سلطنت۔ اِس میں کچھ تامّل نہ کرو۔ کس کی مجال ہے جو اِس پر ہنس سکے۔ لیکن ''ملکہٗ وسلطانہٗ'' علامتِ تذکیر ہے۔ اگر ''ملکہا وسلطانہا'' بن جائے تو بہتر ہے، ورنہ خیر، یوں ہی رہنے دو۔ ہم سے کوئی پوچھے گا، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہ رعایتِ شکوہِ سلطنت ہم نے تانیث کی رعایت نہ کی۔ اور سچ تو یوں ہے کہ اگر کاتب سُگھڑ ہو، تو ہائے ہوز کا شوشہ مٹا دینا اور الف بنا دینا دشوار نہیں ہے۔ بن سکے تو بنوا دو۔ اور ''سلطانہٗ'' کو خدا کے واسطے مت بدلنا۔ یہ بلغائے عرب وعجم کا قرارداد ہے۔ بعد اِس سب تقریر کے عرض ہے کہ پرسوں پنجشبے کو عرضی لکھی ہوئی میرے پاس آجائے ۱۲ غالب ۱۲'' (عکس: نقوش، خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۱۹)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم غلام نجف خاں کے توجّہ دلانے پر ضمیرِ تذکیر وتانیث کے متعلق مرزا صاحب نے یہ لکھا ہے۔

لفظوں کو کہیں کہیں لکھا ہے، بیش تر ان کو مد کے بغیر ہی لکھا ہے۔ اِس بنا پر اِن لفظوں کو متن میں مد کے بغیر لکھا جانا چاہیے، البتہ التزام کے ساتھ حواشی میں ایسے ہر لفظ سے متعلق وضاحت کی جانا چاہیے۔ (لفظِ الٰہ، الٰہی اور اللہ سے متعلق مفصّل معلومات کے لیے دیکھیے دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلدِ سوم، ص ۱۴۴ سے ص ۱۸۷ تک)۔

(ج) مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں لفظوں کی ایسی شکلیں بھی ملتی ہیں جو واضح طور پر لغزشِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ہم سبھی اِس صورتِ حال سے دوچار ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی کبھار بے خیالی میں قلم سے لفظ کی وہ صورت بن جاتی ہے جو مقصود نہیں ہوتی اور قلم آگے بڑھ جاتا ہے۔ اتفاق سے نظر اُس پر پڑ جائے تو ہنسی آتی ہے کہ یہ کیا لکھ دیا۔ یہ غلط نگاری، جسے سہوِ قلم کہنا چاہیے، بے خیالی میں رونما ہوتی ہے؛ اِس بنا پر ایسی غلطیوں کی تصحیح ضروری ہے۔ ایسی کچھ غلطیاں: ''یہ کیونکر جاؤں'' (مرقعِ غالب، ص ۲۶۳) یعنی جانوں۔ ''سلام پانچ ساتھ لکھتے تھے'' (ایضاً ۲۳۵) یعنی: پانچ سات۔ ''سانون کی گہٹائیں'' (ایضاً ۱۸۱) یعنی: سانون کی گھٹائیں۔ ''نپونچہا'' (ایضاً ۲۱۳) یعنی: نہ پہنچا۔ ''تین التماسیں ہے'' (ایضاً ۲۸۰) یعنی: التماسیں ہیں۔ ''میرزا جلالاے طبائے'' (ایضاً ۲۵۳) یعنی: میرزا جلالاے طباطبائی۔ ''تم سے نکہوں'' (ایضاً ۱۹۷) یعنی: تم سے نکہوں (نہ کہوں)۔ ''جب میں قصیدہ بھیجتا اُس کی رسید میں خطِ تحسین و آفریں کا'' (ایضاً ۲۳۶) یہاں جملے کے آخر میں فعل (مثلاً: آتا) لکھنے سے رہ گیا ہے۔

ا۔ مرزا صاحب نے تفتہ کے نام خط میں لکھا ہے:

> ''جس طرح ''اللہ'' میں مشدّد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے،
> الہ، الٰہی میں الفِ ممدودہ کو دوسرا الف کیوں کر سمجھیں۔ قیاس کام نہیں
> آتا، اتفاقِ سلف شرط ہے۔ الٰہی میں جب اور کسی نے دو الف نہیں
> مانے، تو ہم کیوں کر مانیں'' (خطوطِ غالب، ص ۶۹)۔

اِس عبارت سے پہلے ایک جملہ یہ ہے: ''قطعاتِ تاریخ آگرے کو کیوں کر بھیجوں''۔ اِس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ منقولۂ بالا عبارت اعدادِ تاریخ کے سلسلے میں لکھی گئی ہے۔ اِس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا خیال یہ تھا کہ الٰہ اور الٰہی میں الفِ ممدودہ ہے؛ اور اُن کا یہ خیال درست نہیں تھا۔

"میںنے کہا کہ لاحول ولاقوت، اگر یہ کلام میرا ہو تو مجھ پر لعنت" (مکتوب بہ نامِ جنونؔ بریلوی۔ عکس: نقوشؔ (لاہور) خطوط نمبر، جلدِ اوّل، ص ۱۵)۔ "لاحول ولاقوۃ" لکھنا چاہیے تھا۔ یہ عربی کا ٹکڑا ہے اور اِس میں تصرّف مناسب نہیں۔ کئی جگہ مرزا صاحب نے "فرمائیے" لکھا ہے۔ اِس کو بھی لغزشِ قلم کے ذیل میں رکھا جانا چاہیے۔

سہوِ قلم کے ذیل میں جس قدر مثالیں آسکتی ہیں، متن میں اُن سب کو صحیح صورت میں لکھنا چاہیے اور حواشی میں التزام کے ساتھ ایسی ہر تصحیح کی نشان دہی کی جانا چاہیے۔

(۲۴) لفظوں کو ملا کر لکھنا:

مرزا صاحب کی دستی تحریروں میں ایسا کوئی اہتمام نہیں ملتا کہ لفظوں کو ملا کر لکھا جائے یا الگ الگ لکھا جائے۔ اور کیسے ہوتا، اُس زمانے میں یہ اہتمام ملحوظ ہی نہیں رکھا جاتا تھا کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے، یا لکھا جائے۔ جس طرح سب لوگ لکھتے تھے، اُسی طرح مرزا صاحب بھی لکھتے تھے۔ مثلاً تفتہ کے نام کے ایک خط میں، جس کا عکس خطوطِ غالب میں شامل ہے (ص ۶ کے مقابل) "رہ جاتا ہے، نہ دوں، نہ فرمایئے، نہ لکھا کرو، نہ تھا" بھی ہے اور "نکی (نہ کی) نجاوے، نکہیگا، نہیں رکہینگا" بھی ہے۔ فارسی کا فعل "برسد" بھی ہے اور "بہ بیں" بھی لکھا ہے۔ "بہ غلط" بھی ہے اور "بمیرد" بھی ہے۔ اِسی کتاب (خطوطِ غالب) میں میر مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط کا عکس بھی ص ۲۸۱ کے مقابل شامل ہے؛ اِس میں "نہ بھیجو"، "نہ لکھوں" بھی ہے اور "نکہتا ہوگا" بھی ہے۔ "بے تکلف، مرنے کی خبر" میں منفصل اجزا ہیں، اسی طرح "کسی نے" میں۔ اِس کے ساتھ ساتھ "کہیگا" اور "کہدونگا" بھی ہے۔ اِس میں مرزا صاحب اکیلے نہیں، سبھی اِسی طرح لکھتے تھے کہ جہاں جو مرکّب قلم سے جس طرح نکل گیا۔

تدوین کی تکمیل کے لحاظ سے یہ مناسب ہے کہ ممکن حد تک املا میں یکسانی ہو۔ مرتب کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اپنے طریقِ کار کو طے کرے اور پھر آخر تک اُس کی پابندی کرے۔ اب بہ طورِ عموم دو لفظوں کو ملا کر لکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا، جیسے: اسکو، اسنے، تجھمیں، نکہیگا، نکیا، نجاؤ، دلچسپ، کہینگے، لکھیگا وغیرہ۔ اب اِن کو "اُس کو، اُس نے، تجھ میں، نہ کہے گا، نہ کیا، نہ جاؤ، دل

چسپ، کہیں گے، لکھے گا" لکھا جاتا ہے۔ افعال کے لاحقوں کو اور اسما کے سابقوں کو اور بہت سے لاحقوں کو بھی الگ لکھنا ہی بہتر طریقِ املا ہے۔ مرتّب کے لیے یہ ازبس ضروری ہوگا کہ اردو اور فارسی، دونوں زبانوں کی تخلیقات کے متعلق اپنا طریقِ املا طے کرے اور وضاحت کے ساتھ اُس کو مقدّمے میں بیان بھی کردے۔ اِس طرح وہ خود بھی مجبور ہوگا کہ آخر تک اُن تفصیلات کو پیشِ نظر رکھے اور اُن کی پابندی کرے۔

املاے فارسی

ہمارے یہاں اب تک اصولِ تدوین کی پابندی کے ساتھ مرزا صاحب کے فارسی کلام کا کوئی مجموعہ مرتّب نہیں ہوا، اِس لیے کلامِ غالب کے سلسلے میں املا کے مسائل بھی سامنے نہیں آسکے۔ اِن میں سب سے اہم اور توجہ طلب ہے مجہول اور غنّہ آوازوں کا تعیّن تلفظ میں اور اُس کے واسطے سے املا میں۔ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جدید فارسی میں، یا یوں کہیے کہ تہرانی لہجے میں مجہول آوازیں شامل نہیں[1]۔ یہی احوال غنّہ آواز کا ہے۔ اب جدید فارسی میں ہر یٰ معروف ہے اور ہر نون کو اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً "شخصے" کو "شخصی" لکھا جائے گا، پڑھا بھی جائے گا اِسی طرح؛ اور مثلاً "جہاں" کو "جہان" لکھا جائے گا اور تلفظ میں الف ساقط ہو جائے گا، اِس کے برخلاف ہندستانی فارسی میں شروع سے اب تک یہ دونوں آوازیں شاملِ تلفظ رہی ہیں۔ مرزا صاحب نے بار بار اِس کی وضاحت کی ہے کہ فُلاں لفظ میں یٰ معروف ہے یا

۱۔ اِس سلسلے کی تفصیلات سے یہاں قطعِ نظر کی جاتی ہے۔ ضروری تفصیلات اور حوالوں کے لیے تین مقالوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے: مقالہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی بہ عنوانِ "فارسی کا ہندستانی لہجہ" اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مقالہ: "دو ہندا ایرانی مصوّتے" (مشمولہ نذرِ مالک، جلدِ اوّل و جلدِ دوم)۔ راقم الحروف کی تحریر بہ عنوانِ "ہندستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل"۔ یہ تحریر راقم الحروف کے مجموعہ مضامین تفہیم میں شامل ہے۔ نیز اس سلسلے میں لسان الملک محمد تقی سپہر کاشانی کی کتاب براہین العجم فی قوانین المعجم کا ضرور مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

مجہول۔ بار بار اِس طرف توجہ دلائی ہے کہ آخرِ لفظ میں شامل یاے وحدت، یاے تنکیر اور یاے تعظیم لازماً مجہول ہوتی ہے اور جو لوگ جدید تہرانی لہجے کی مطابقت میں لفظوں کو ادا کرتے ہیں اور غنّہ آواز کو بدل دیتے ہیں، اُن کی تقلید سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے؛ یہاں تک کہ لہجے کی اِس تقلید کو بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام بتایا ہے۔ اِس پر اصرار کیا ہے کہ شاعر اور دبیر کو قواعد کی پابندی کرنا چاہیے، لہجے کی تقلید نہیں کرنا چاہیے۔ مرزا صاحب کی اِن صراحتوں سے یہ بات وضاحت اور قطعیّت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ مرزا صاحب کے کلامِ نظم و نثرِ فارسی میں کہاں کہاں لازماً یاے مجہو آئے گی اور کن لفظوں میں واوِ مجہول ہوتا ہے۔

(۱) یاے مجہول :

(الف) یاے وحدت، یاے تنکیر، یاے تعظیم:

چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

''اے کریمے کہ از خزانۂ غیب؛ ہرگز یاے معروف نہیں، یاے مجہول ہے۔ یاے معروف یہاں نامقبول ہے۔

خدائے کہ بالا و پست آفرید: ایسا خدا، ایسا کریم؛ اِس تحتانی کو یاے وحدت کہو، توصیف کہو، یاے تعظیم کہو؛ جس طرح کہو، مجہول آئے گی'' (ادبی خطوطِ غالب، ص ۳۵)۔

یہی بات تفتہ کے نام خط میں لکھی ہے:

''یاد رکھو، یاے تحتانی تین طرح پر ہے... تیسری دو طرح پر: یاے مصدری، اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح: توحید و تنکیر، وہ مجہول ہوگی'' (خطوطِ غالب، ص ۲۴)۔

منشی کیول رام ہشیار کو یہی بات اِس طرح سمجھائی ہے:

''''کے'' بہ کافِ عربی مفتوح، بروزنِ مے، ایک لغتِ فارسی ہے... الف جو اُس کے آگے آتا ہے، وہ کثرت کے معنی دیتا

ہے... کیا: بڑا حاکم۔

عشقِ آں بگزیں کہ جملہ اولیا یافتند از عشقِ او کارِ کیا

یعنی بہ سبب عشق کارِ بزرگ یافتند۔

سر فرو بردیم، تا بر سروراں سرور شدیم چاکری کردیم، تا کارِ کیائی یافتیم

یہاں بھی وہ کارِ بزرگ، یعنی بڑا کام۔ پس تحتانی اگر مجہول ہے، تو تعظیمی ہے۔ اگر معروف ہے، تو مصدری ہے'' (ادبی خطوطِ غالب، ص ۱۴۰)۔

عبدالرحمٰن تحسین کو یہی یائے معروف و مجہول میں فرق کی بات یوں سمجھائی ہے:

''اور یہ کہاں کا دستور ہے کہ یائے معروف کے تلے دو نقطے دیے جائیں؟ معہذا، یہ سوال ہے کہ ''زہدِ ریائی'' کی ی کو مجہول کون کہتا ہے؟ توحید، تنکیر اور توصیف کے لیے مجہول ہوتی ہے، اور نسبتی اور مصدری ی معروف ہوتی ہے....

ع: مرا یارے ست سنگیں دل، ستم گر، سست پیمانے: ''یارے'' کے لیے مجہول، ''سنگیں'' کے لیے معروف، ''پیمانے'' کے لیے مجہول۔ ''دمِ آبے ساقی'' و ''عتابے ساقی'' یہ جو تمھاری غزل ہے، اس میں قوافی کی تحتانیاں سب مجہول ہیں، اور ردیف کی تحتانی معروف'' (غالب کے خطوط، ص ۱۵۹۴)۔

یعنی مرزا صاحب کی وضاحت کے مطابق (نیز لغات اور کُتبِ قواعد کی صراحتوں کے مطابق) یائے وحدت، یائے تنکیر اور یائے تعظیم مجہول ہوتی ہے۔ اس کے مطابق اس کو یائے مجہول کی صورت میں لکھا جائے گا، یعنی: شخصے (ایک شخص، یا کوئی شخص) خدائے کہ (ایسا خدا جس نے)۔ ایسے کلمات کے آخر میں اگر ی (یعنی معروف شکل) لکھی جائے گی، تو اِسے نادرست کہا جائے گا۔ کلامِ غالب کے لیے یہ قطعی طور پر غلط املا ہوگا۔ مرزا صاحب کا مطلع ہے:

ا۔ یعنی ''کارِ کیائی'' میں یائے مصدری ہے اور ''کارِ کیائے'' میں ے تعظیمی ہوگی۔ مقصود وہی ہے کہ یائے مصدری معروف ہوتی ہے اور یائے تعظیمی (اور یائے وحدت و یائے تنکیر) مجہول ہوتی ہے۔

اے ز وہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ گفتہ خود حرفے وخود را در گماں انداختہ

اِس کو اگر اِس صورت سے لکھا جائے:

اَے ز وہمِ غیر غوغا در جہان انداختہ گفتہ خود حرفی وخود را در گمان انداختہ

تو اِس کتابت کو نادرست قرار دیا جائے گا۔

مکن ناز و ادا چندیں دلے بستان و جانے ہم دماغِ نازکِ من برنمے تابد تقاضا را

اِس کو اگر اِس طرح لکھا جائے:

مکن ناز و ادا چندین دلی بستان و جانی ہم دماغِ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را

تو بہ لحاظِ املا اِس صورت نگاری کو غلط سمجھا جائے گا اور یوں غلط سمجھا جائے گا کہ مرزا صاحب نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ یاے تنکیر و وحدت مجہول ہوتی ہے: ''ہرگز یاے معروف نہیں، یاے مجہول ہے''۔ اور پھر مزید تاکید کی ہے: ''یاے معروف یہاں نامقبول ہے''۔

(ب) رفتے، مے رفت:

''ہرگاہ خواہند کہ ماضی را استمراری سازند، میم وتحتانیِ مجہول ماقبلِ صیغۂ ماضی آرند، چنانکہ: ''رفت'' ماضی، و''مے رفت'' ماضیِ استمراری۔

ہم چنیں تحتانیِ مجہول تنہا در آخرِ صیغۂ ماضی ہماں کارے کند کہ میم و یاے مجہول در اوّل، چنانکہ: ''مے رفت'' و ''رفتے'' بہ یک معنی است۔

وہمیں میم و یاے مجہول است کہ ماقبلِ صیغۂ ماضی معنیِ تمنا و شرط دہد۔ وتنہا تحتانی مابعدِ صیغۂ ماضی نیز ہمیں کار کند۔ دیگر ایں میم وتحتانیِ مجہول در اوّلِ صیغۂ مضارع افادۂ معنیِ دوام در استقبال مے کند'' (قاطع، ص ۱۶۶)۔

''شدے، بہ یاے مجہول، بہ معنیِ مے شد'' (فرہنگ غالب، ص ۱۵۵)۔

مرزا صاحب نے ہر جگہ ''یاے مجہول'' لکھا ہے اور اِس سے مراد ہے اِس پر تاکید کہ اِن افعال میں مجہول ے ہے۔ اِس وضاحت اور تاکید کی روشنی میں یہ لازم ہے کہ مرزا صاحب کی فارسی نظم ونثر

میں ماضیِ استمراری اور ماضیِ تمنائی میں بہ طورِ سابقہ ''مے'' لکھا جائے۔ ماضیِ تمنائی کو شرطیہ طور پر لایا جائے، تب بھی اُسے بہ یاے مجہول لکھا جائے گا۔ اِسی طرح فعلِ حال میں بھی ''مے'' آئے گا۔ کہیں بھی ''می'' نہیں لکھا جائے گا، جیسے: مے رفت، مے کرد، مے نوشت۔ کردے، رفتے، نوشتے۔ مے کند، مے رود، مے نویسد۔ ''مے رفت'' اور ''مے رود'' کو ''میرفت'' اور ''میرود'' بھی لکھا جا سکتا ہے (وغیرہ) مگر تلفظ میں مجہول آواز شامل رہے گی؛ یعنی 'مے رفت' لکھا جائے یا ''میرفت''، تلفظ میں ''مے'' کی آواز نکلے گی۔ ماضیِ استمراری کو مثلاً ''می رفت'' لکھنا یا ماضیِ تمنائی کو ''رفتی'' لکھنا اور فعلِ حال کو مثلاً ''می رود'' لکھنا کلامِ غالب میں غلط املا مانا جائے گا۔ اِسی طرح ''میرفت'' کو ''می رفت'' پڑھنا بھی ناقابلِ قبول رہے گا۔ اِس کا التزام کیا جائے گا کہ اِن سب افعال کی شکلوں میں بہ طورِ سابقہ ''مے'' لکھا جائے اور مفہومِ شرط کے لیے بھی ''ے'' کا اضافہ کیا جائے اور تلفظ میں بھی ہر صورت میں مجہول آواز شامل رہے۔

(ج) ۔۔:مرزا صاحب نے متعدّد الفاظ کے تحت اِس کی بھی صراحت کی ہے کہ اُن میں (درمیانِ لفظ) جو یٰ ہے، وہ معروف ہے یا مجہول۔ جن لفظوں میں یاے مجہول کی صراحت کی ہے، وہ درجِ ذیل ہیں۔ ایسے لفظوں میں املا کا تو کوئی مسئلہ ہے نہیں؛ اِس کے باوجود، اِن کا حوالہ یوں دیا جا رہا ہے کہ (الف) یہ بات اور واضح ہو جائے کہ مرزا صاحب (یہاں کی لسانی روایت کے مطابق) یاے مجہول کے قائل تھے۔ (ب) جب ایسے لفظوں کو زبان سے ادا کیا جائے، تو اِن میں شامل یاے مجہول کی آواز کو ملحوظ رکھا جائے۔ محض تقلید میں اُس مجہول آواز کو معروف آواز سے نہ بدلا جائے:

''ایل: بہ الفِ مکسور و یاے مجہول؛ در زبانِ مغلی گروہ را گویند'' (قاطع، ص ۷۵)۔

''انکبہ: ....صحیح ''ایکبہ'' است بہ الفِ مکسور و یاے مجہول و کافِ عربیِ مضموم، بروزنِ بے خُصیہ'' (ایضاً ص ۴۰)۔

''خشخانہ...صحیح خیشخانہ است، بہ یاے تحتانیِ مجہول، بروزنِ پیش خانہ'' (ایضاً ص ۴۷)۔

''دیس: بہ دالِ مکسور و یاے مجہول، لغتے است فارسی، بہ معنیِ مثل و مانند'' (ایضاً ص ۸۳)۔

''کدیور: بہ کافِ تازی مفتوح و دالِ مکسور و یاے مجہول، مزارع و باغبان'' (پنج آہنگ، ص۱۱۶)۔

''گریوہ: بہ گافِ مفتوح و راے مکسور و یاے مجہول، اسمِ بلندی کہ در صحرا باشد'' (ایضاً، ص۱۱۴)۔

''نوید: بہ نونِ مفتوح و یاے مجہول۔۔۔ نبید: بہ فتحِ نون و یاے معروف، در عربی شرابِ خرما را گویند؛ و با تحتانیِ مجہول بدلِ ''نوید'' است کہ لغتے است فارسی، بہ معنیِ خوش'' (قاطع، ص۱۲۹)۔

''ویژہ: بہ واوِ مکسور و یاے تحتانیِ مجہول و زاے فارسیِ مفتوح، لفظِ فارسیِ قدیم است'' (فرہنگِ غالب، ص۲۵۲)۔

بالفرض ہم ''وِیژہ'' کو ''ویژہ'' پڑھیں، یا ''کدِیور'' کو ''کدیور'' کہیں؛ تو ہم پر مرزا صاحب کا وہ قول صادق آئے گا کہ ''لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے''۔

(۲) واوِ مجہول:

جس طرح متعدّد الفاظ سے متعلّق مرزا صاحب نے یہ صراحت کی ہے کہ اُن میں معروف ی ہے یا مجہول ے؛ اُسی طرح متعدّد لفظوں سے متعلّق یہ صراحت بھی کی ہے کہ اُن میں واو معروف ہے یا مجہول۔ جن لفظوں میں مجہول واو کی نشان دہی کی ہے، یہ ہیں:

''بانو: بہ موحدہ و الف و نونِ مضموم و واوِ مجہول، مرادفِ خاتون است'' (قاطع، ص۱۷۱)۔

''پاغوش: بہ عینِ مضموم و واوِ مجہول، بہ معنیِ غوطہ'' (پنج آہنگ، ص۱۱۳)۔

''پوشتن: بہ باے فارسیِ مضموم و واوِ مجہول۔۔۔ مصدریست فارسی الاصل'' (قاطع، ص۱۶۳)۔

''روم: بہ راے مضموم و واوِ مجہول، فارسی میں موے زہار، اور ہندی میں مسام کو کہتے ہیں'' (قاطع، ص۲۸۷)۔

''سوم: بہ سینِ مضموم و واوِ مجہول، در ہر دو زبان اسمِ ماہ'' (ایضاً ص۱۶۸)۔

''شکوہ: بہ ضمِ شینِ زنہار نیست۔ ہماں بہ کسرۂ شین و ضمۂ کاف و واوِ مجہول'' (ایضاً ص۹۶)۔

''فسوس: بہ ضمتین و واوِ مجہول۔۔۔'' (ایضاً ص۱۰۶)۔

"کشکول: بہ کافِ مفتوح و واوِ مجہول.... تسویہ وزنِ "مقبول" با "کشکول" نامقبول است، زیرا کہ "مقبول" بہ واوِ معروف و "کشکول" بہ واوِ مجہول" (ایضاً ص ۱۱۵)۔

"گُول: در فارسی "گُول" بہ کافِ عربی مضموم و واوِ مجہول، بوم را گویند" (ایضاً ص ۱۵۱)۔

"گول: بہ کافِ فارسی مضموم و واوِ مجہول..." (ایضاً ص ۱۵۲)۔

"مدہوش: پارسیاں تصرف کردہ بہ واوِ مجہول، مرادفِ مست و بے خود مے آرند" (ایضاً ص ۱۲۱)۔

"نُوجہ: بہ نونِ مضموم و واوِ مجہول، اسمِ سیل است" (ایضاً، ص ۱۳۷)۔

یاے مجہول اور واوِ مجہول کی اِن تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ مرزا صاحب تلفظ اور املا میں یہاں کی روایت کو مانتے تھے۔ اِس بنا پر یہ لازم ہے کہ اُن کے کلام کی کتابت میں اور اُن کے اشعار اور نثر کی قرائت میں مجہول آوازوں کو بہ طورِ التزام ملحوظ رکھا جائے۔ اگر اِس کے خلاف کیا جائے گا، یعنی (بہ طورِ مثال) "شخصے" کو "شخصی" لکھا جائے گا، یا "میرسد" کو (مثلاً) "می رسد" کہا جائے گا ("مے رسد" کے بجاے) تو اِسے قطعی طور پر ناقابلِ قبول قرار دیا جائے گا۔

(۳) ماقبلِ ہاے مختفی:

اِسی ہندستانی روایت کی مزید توثیق کے لیے ماقبلِ ہاے مختفی کے مفتوح ہونے کے سلسلے میں مرزا صاحب نے جو صراحتیں کی ہیں، اُن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جدید فارسی میں (یعنی تہرانی لہجے میں) ماقبلِ ہاے مختفی مکسور ہوجاتا ہے، جب کہ ہندستانی روایت کے مطابق یہ مفتوح رہتا ہے۔

بِرکہ: بہ کسرۂ باے موحدہ و فتحہ کافِ تازی و اخفاے ہاے ہوز: بہ معنیِ حوض" فرہنگِ غالب، ص ۴۷)۔

"پَلہ: بہ باے فارسیِ مفتوح و لامِ مفتوحہ، ہندیِ آں: پیوی" (ایضاً ص ۶۷)۔

"چکسہ: بہ جیمِ فارسیِ مفتوح بہ کافِ پیوستہ و سینِ مفتوح بہ ہاے ہوز زدہ... بہ ہندی "پُڑیا" گویند" (ایضاً ص ۹۳)۔

''خُرَہ: بہ خاے مضموم و راے مفتوح و ہاے مختفی؛ نورِ قاہر را گویند'' (ص ۱۰۱)۔

''رَدَہ: بہ ہر دو فتحہ؛ صف''۔ (ایضاً ۱۲۴)۔

''رَزَہ: بہ فتحتین: الگنی'' (ایضاً ص ۱۲۴)۔

''زَچہ: بہ جیمِ سہ نقطہ، بہ فتحتین؛ زنِ نوزائیدہ'' (ایضاً ۱۳۲)۔

''شَرزَہ: بہ شین و زاے مفتوح؛ صفتِ شیر، بہ معنیِ خشمگیں'' (ایضاً ۱۵۵)۔

''شیہہ:... بہ شینِ مکسور و یاے معروف و ہاے ہوّزِ مفتوح و ہاے ثانی زدہ'' (ایضاً ص ۱۶۳)۔

''کچہ: بہ کافِ تازیِ مفتوح و جیمِ فارسیِ مفتوح؛ ہندیِ آں: چھلا'' (ایضاً ۱۹۷)۔

''شِنَوسَہ: بہ شینِ مکسور و نونِ مفتوح و سینِ مفتوح و ہاے مختفی؛ عطسہ را نامند'' (قاطع ص ۸۹)۔

''وِیژہ: بہ واوِ مکسور و یاے تحتانیِ مجہول و زاے فارسیِ مفتوح'' (ایضاً ۲۵۲)۔

اِسی سلسلے میں اسمِ فاعل کی حرکات خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ مرزا صاحب نے اِس کی وضاحت اِس طرح کی ہے:

> ''و آخرِ ہر مضارع بجز دال نیست، چوں: کند و گوید۔ اسمِ فاعل از نفسِ مضارع مے خیزد، و روشِ آں این است کہ حرفے را کہ بہ دال پیوستہ است، از و بکشند و بہ حرکتِ کسری بہ نون زنند۔ چوں آں ساکن خواہد بود، دال را کہ در حالتِ مضارعیت آرمیدہ بود، بہ حرکتِ فتحی جنبش دادہ بہ ہاے ہوّز بدوزند۔ چوں: کُنِندَہ، از کُنَد۔ و گویندہ، از گوید'' (پنج آہنگ، ص ۹۹)۔

یعنی اسمِ فاعل کو (تقلیداً) کُنَندِہ، گویَندِہ، آیندِہ (وغیرہ) کہنا درست نہیں ہوگا۔

(۴) اَت۔ ت (ضمیرِ مخاطب):

''ضمیرِ مخاطب تنہا تاے قرشت است، نہ ''اَت''۔ مثلاً:

غلامت، نامت۔ یادلت ومملت۔ واین چنیں الفاظ بیش از آنست کہ در شمار آید۔۔۔۔اگر آخرِ کلمہ مبنی بر حروفِ دیگر است، حرفِ آخر را بہ تاے قرشت میدوزند۔

ہاے اصلی، چنانکہ در کلاہ و سپاہ و زرہ و گرہ است، نیز ایں حال دارد؛ خاص از بہرِ ہاے اِنہاے حرکت، کہ در خانہ و کاشانہ و چشمہ و غمزہ است، ہمزہ ے آرند و آنرا بہ تاے ضمیرِ مخاطب ے زنند؛[1] تا پدید آید کہ ہاے اِنہاے حرکت را وجود اعتباریست، نہ وجودِ حقیقی؛ لاجرم جز بہ وساطتِ ہمزہ بہ حرفِ دیگر نے تواند پیوست" (قاطع، ص ۳۰)۔

(ب) اَش۔ش (ضمیرِ غائب):

"خطابِ واحد غائب فقط شین ہے، نہ "اَش"۔ ہاں اگر آخرِ لفظ مبنی ہاے اِنہاے حرکت پر ہو، مثلِ غمزہ و چشمہ و خانہ و دانہ؛ تو اُس کو یوں لکھتے ہیں: چشمہ اش، غمزہ اش، خانہ اش، دانہ اش۔ اور باقی سب الفاظ کا حرفِ آخر شین سے مل جاتا ہے۔ خطابِ واحد حاضر، خطاب واحد غائب، خطابِ واحد متکلم ت، ش، م ہے" (مکتوب بہ نامِ چودھری عبدالغفور سرور: ادبی خطوطِ غالب، ص ۲۸)۔

عبدالرحمٰن تحسین کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے اِسی قاعدے کی تکرار کی ہے، البتہ آخر میں ایک جملے کا اضافہ ہے جو ہمارے کام کا ہے۔ لکھا ہے: "مژہت" محض غلط اور غلط

ا۔ مثلاً: خانہ ات، غمزہ ات، کاشانہ ات (بہ معنی خانہ تو، غمزۂ تو، کاشانہ تو)۔ مقصود یہ ہے کہ ضمیرِ مخاطب تو "ت" ہے، جو عام لفظوں کے آخر میں لکھی جاتی ہے، جیسے: دل سے دلت، اور جیسے: نام سے نامت۔ اور راہ سے راہت، اور زرہ سے زرہت۔ البتہ جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہوتی ہے، اُن میں "ات" کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: خانہ ات اور کاشانہ ات۔

محض''۔ مقصود یہ ہے کہ ''مژہ'' کے آخر میں ہ ہے، اِس بنا پر کسی ضمیر کا جب اُس کے بعد اضافہ ہوگا تو ''مژہ ات، مژہ اش، مژہ ام'' لکھا جائے گا۔ الف کا حذف کرنا جائز نہیں ہوگا۔ ایسے جملہ الفاظ کے املا میں اِس بات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

(۵) بردۂ، رفتۂ:

''بردۂ، رفتۂ؛ یہ جتنے الفاظ ہیں، اِن میں یاے تحتانی نہیں لکھتے، بس وہی ہاے اِنہاے حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے، تو تو ''رفتہ''، ''بردہ'' اِس صورت پر رہے گی۔ اور اگر اُس کو حرکت لازم آئے، تو علامتِ حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا: رفتۂ، آمدۂ۔ اور اِن مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے''

(بہ نامِ جنونؔ بریلوی: خطوطِ غالب، ص ۱۱۸)۔

مرزا صاحب کی تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ماضیِ قریب کے صیغۂ امرِ حاضر میں علامتِ حاضر کے طور پر ہ پر ہمزہ لکھا جائے گا، یعنی: رفتۂ، کردۂ، گفتۂ، نوشتۂ۔ ایسے الفاظ کو ''ای'' کے اضافے کے ساتھ رفتہ ای، کردہ ای، گفتہ ای، نوشتہ ای (وغیرہ) نہیں لکھا جائے گا۔ اگرچہ اب عموماً رفتہ ای اور کردہ ای (وغیرہ) لکھتے ہیں؛ مگر مرزا صاحب کے کلامِ نظم و نثر میں اُن کے مقرّر کردہ املا کی پابندی کی جائے گی۔ مرزا صاحب کے زمانے میں ایسے الفاظ کا یہ املا (کردۂ، رفتۂ) عام تھا۔

خطابِ حاضر کی ایسی سبھی صورتوں میں، جب لفظ کے آخر میں ہاے مختفی ہو، کلامِ غالب میں ایسے کلمات کو اِسی طرح (مع ہمزہ) لکھا جانا چاہیے۔ عرشی صاحب نے انتخابِ غالب میں اِس کی پابندی کی ہے، جیسے: کۂ (ک ای)، نۂ (ن ای)، کشتۂ (کشتہ ای)۔ صرف چند مثالیں:

نومیدی از تو کفر و تو راضی نۂ بہ کفر نومیدیم دگر بتو امید وار کرد (۹۴)

غالب! بدیں نشاط کہ وابستۂ کۂ برخویشتن ببال و بہ بندِ بلا برقص (۱۱۴)

دانستۂ کہ عاشقِ زارم، گدا نیم دانم کہ شاہدی، شہِ گیتی ستاں نۂ (۱۶۰)

شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم ببیں کہ بے شرر و شعلہ میتوانم سوخت (۴۶)

بجرمِ دیدۂ خونبار کشتہ مارا تراز دامن و ماراز آستیں پیداست (۴۳)

(۶) ۂ برائے وحدت و تنکیر:

جن لفظوں کے آخر میں ہائے ملفوظ ہوتی ہے، اُن کے آخر میں یائے وحدت اور یائے تنکیر کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: راہے، شاہے، ماہے، گلاہے (وغیرہ)۔

جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے، اُن میں اُس مختفی ہ پر ہمزہ لکھ دیا جاتا تھا، جیسے: جلوۂ (ایک جلوہ یا کوئی جلوہ) پردۂ (ایک پردہ یا کوئی پردہ)۔ مرزا صاحب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''خستہ، بستہ، تازہ، غازہ، خانہ، دانہ، آوارہ، بیچارہ، روزہ، بوزہ؛ ہزار لفظ ہیں کہ اُن کے آگے جب یائے توحید آتی ہے، تو اُس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔
>
> زرہ، گرہ، کلاہ، شاہ، آگاہ، آگہ، صبح گاہ، صبح گہ؛ ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے، تو زرہے، گرہے، کلاہے، شاہے، آگاہے، آگہے، گہے لکھ دیتے ہیں'' (خطوطِ غالب، ص ۲۴)۔

عرشی صاحب نے انتخابِ غالب میں اس کی بھی پابندی کی ہے، دو چار مثالیں:

درگوشۂ خزیدہ ز اندوہِ بیکسی آں بر شکستہ خلوتِ دل ہائے تنگ را (۱۹)

مے رنجد از تحملِ ما بر جفائے خویش ہاں شکوۂ کہ خاطرِ دل دار نازکست (۳۹)

افغانِ مرا بیہشیِ ساختہ نیست در زمزمہ، بوے جگر سوختہ ہست (۵۵)

در دیدہ، زرخ پردہ برانداختہ نیست در سینہ، دوصد عربدہ اندوختہ ہست (۵۵)

در راہِ ثوابش، قدر افروختہ نیست در بزمِ عتابش، رُخِ افروختہ ہست (۵۵)

(۷) ۂ برائے اضافت:

''چشمہ و کرشمہ و غمزہ و مژہ، اگر مضاف واقع ہوں، تو ہمزہ

علامتِ کسرہ ہوا کرتا ہے''۔

(بہ نامِ عبدالرحمٰن تحسین: غالب کے خطوط، ص ۱۵۹۳)۔

جیسے: گفتۂ غالب، چشمۂ شیریں، کرشمۂ وفا، غمزۂ محبوب، مژۂ دراز، پردۂ مجاز۔ اضافت کا یہ عام قاعدہ ہے۔ یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ اضافت کے لیے ہمزہ صرف اِس ایک صورت میں آتا ہے، اور کہیں بھی اضافت کے لیے ہمزہ نہیں لکھا جانا چاہیے۔ اِس کی وضاحت اِس سے پہلے کی جا چکی ہے۔

(۸) نونِ غنہ:

غنہ آواز ہندستانی صوتیات کا جزو رہی ہے۔ یہ آواز (مجہول آوازوں کی طرح) فارسی میں بھی تھی۔ لغات اور قواعد کی کتابوں میں اِس کی جگہ جگہ نشان دہی ملے گی۔ جدید فارسی کے لہجے میں (مجہول آوازوں کی طرح) غنہ آواز بھی شامل نہیں، لیکن فارسی کی ہندستانی روایت میں یہ شامل تھی اور شامل ہے۔ خود ایرانی اہلِ قلم بھی اِس بات کو پوری طرح مانتے ہیں۔ تفصیل کی تو یہاں گنجایش نہیں، میں صرف ایک حوالے پر اکتفا کروں گا۔ معروف اور ممتاز ایرانی فاضل بہار نے اپنی قابلِ قدر تصنیف سبک شناسی میں لکھا ہے:

> ''در رسم الخطِ ہند دو نکتہ وجود داشتہ و دارد، کہ در ایران بے سابقہ است، و گویا در خراسان قدیماً بودہ است... و آں معیّن کردنِ نونِ غنہ و یاءِ مجہول است در کتابت....''۔
>
> یاءِ مجہول، یائیست در وسط یا آخرِ کلمہ کہ صدای کسرہ میدادہ است... و متقدّمان ازین روی یاءِ مجہول را با یاءِ معروف قافیہ نمیکردند... در کتبِ ایران ہیچ امتیازی برای شناختن آنہا در دست نداریم، امّا خطاطانِ ہند این امتیاز را در نونِ غنہ و یاءِ مجہول یا ماقبل مفتوح محفوظ داشتہ و دارند۔ و ہم اکنوں اُستادانِ خط نونِ غنہ را در آخر بدونِ نقطہ نویسند و در وسط علامتے مانندِ عددِ ہفت

روی آں گزارند و آنرا در خیشوم و بینی تلفّظ کنند" (جلدِ سوم، ص ۳۰۹)۔

دیگر ہندستانی مصنفین کی طرح مرزا صاحب بھی یاے مجہول، واوِ مجہول، یاے لین اور نونِ غنّہ کے امتیازات کو پوری طرح تسلیم کرتے تھے۔ مجہول آوازوں سے متعلق اُن کے اقوال نقل کیے جا چکے ہیں۔ تیغ تیز میں اُنھوں نے اِس کا بہت مذاق اُڑایا ہے کہ جن لفظوں میں نونِ غنّہ ہوتا ہے، اُن کا تلفظ ایرانیوں کی طرح کیا جائے۔ اِسے وہ لہجے کی تقلید مانتے تھے اور لہجے کی تقلید کو اُنھوں نے بھانڈوں اور بہروپیوں کا کام بتایا ہے:

"اِسی ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں جہاں "کندیدن" کو غلط بتاتے ہیں، اور "ماند" و "خواند" کو بروزنِ "چاند" غلط بتاتے ہیں اور "مُند" و "کُند" کو بروزنِ شُند و کُند صحیح فرماتے ہیں... لاحول وَلاقوۃ اِلا باللہ! اہلِ ایران الف کو سُلا دیتے ہیں، اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبع قواعد کا چاہیے۔ لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے" (قاطع، ص ۲۷)۔

اِس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا صاحب کے فارسی کلام میں مجہول آوازوں کے ساتھ ساتھ غنّہ آواز کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ چوں کہ ہندستان میں حتمی طور پر یہ طریقِ کتابت مان لیا گیا ہے کہ آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنّہ کو نقطے کے بغیر لکھا جائے، اِس لیے اِسی طریقِ کتابت کی پابندی اختیار کی جائے گی۔ اِس سے پہلے اِس کی مکمل طور پر پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ جس طرح آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف و یاے مجہول کی صورت نگاری میں کسی طرح کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا، اُسی طرح نونِ غنّہ کو بھی التزاماً بغیر نقطہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ املا نہیں تھا، روشِ کتابت تھی، جو بدل گئی۔ اِس لیے اب جس طرح ی اور ے کے لکھنے میں امتیاز کو ملحوظ رکھا جائے گا، اُسی طرح جاں اور جہاں جیسے لفظوں میں نونِ غنّہ کی کتابت میں بھی امتیاز کو ملحوظ رکھا جائے گا، اُردو میں بھی اور فارسی میں بھی، دونوں زبانوں میں۔

اور فارسی میں ایسے الفاظ کو پڑھا بھی اُسی طرح جائے گا جس طرح اُردو میں پڑھا جاتا ہے، غنّہ آواز کی رعایت کے ساتھ۔ اگر اِس کے خلاف کیا جائے گا تو اُسے لہجے کی ایسی تقلید کہا جائے گا جس کے متعلق مرزا صاحب کے الفاظ اوپر نقل کیے جا چکے ہیں۔

نونِ غنّہ کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عرشی صاحب نے انتخابِ غالب میں آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنّہ کو ہر جگہ نقطے دار رکھا ہے۔ یہ جدید ایرانی روش کی تقلید ہے۔ مرزا صاحب کے منقولہ بالا اقوال کی روشنی میں اُن کے فارسی کلامِ نظم و نثر میں جس طرح مجہول آواز کے لیے ے لکھی جائے گی بالالتزام، اُسی طرح نونِ غنّہ کو نقطے کے بغیر لکھا جائے گا۔

املاے فارسی کے سلسلے میں ''است'' اور علامتِ جمع ''ہا'' کا متصل یا منفصل لکھا جانا، ذ اور ز وغیرہ کی بحث پہلے حصے میں آچکی ہے۔ املاے فارسی کے دوسرے عام قواعد اور مسائل کے لیے قواعد کی کتابوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ''املاے فارسی'' کے عنوان سے راقم الحروف نے بھی ایک طویل مقالہ لکھا ہے، جو میری کتاب اُردو املا میں شامل ہے، اُسے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔



میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں